اختر

تجھ سا اور کہاں سے لائیں

انتیس کے بجائے پوربی محاورے میں 'اُنتیس' کہتے تھے۔ جب محفل جمتی تھی لمبی جمتی تھی اور خوب جمتی تھی۔ ان کے گھر پر (جن دنوں وہ ڈاکٹر وحید الدین صاحب کے ہاں رہتے تھے)۔ یا میرے گھر پر کم کم ——— کافی ہاؤس میں زیادہ۔ چھوٹے بھائی سرور کراچی کے طالب علموں کے بے تاج بادشاہ ہونے کی حیثیت سے مشہور رہتے تھے۔ لیکن ان سے ملاقات کئی برس بعد ہوئی۔ ۱۹۵۴ء میں ایک دن ایسا ہوا کہ میں ان کے گھر پر گیا اور باغیچے میں سے آواز دی ——— اُوپر سے نوکر نے کہا ——— "ابھی آتے ہیں"۔ اتنی راہ دکھانا خلافِ دستور تھا۔ یا اُوپر بلا لیتے تھے یا نیچے آجاتے تھے۔ تھوڑی دیر میں برآمد ہوئے۔ اچھے دُھلے دُھلائے قاعدہ کے کپڑے پہنے ہوئے ——— کہنے لگے ——— اخاہ ——— تم نے مجھے ناحق پریشان کیا نام بتا دیا ہوتا ——— میں نے کہا ——— خیر باشد ——— کہنے لگے۔ چند دن ہوئے ایک صاحب آئے تھے۔ سرور کو بُلایا وہ اسی طرح میلی قمیص اور پاجامہ میں بلا شیو کئے ملنے چلا گیا۔ اسی حالت میں پکڑ لے گئے۔ میں سمجھا کہ میرا نمبر آگیا۔ میں نہیں چاہتا کہ اس نادیدنی حالت میں پکڑا جاؤں اس لئے ہمیشہ تیار ہو کر آتا ہوں۔

میں نے کہا ——— سرور تو طالب علموں کا نیتا جی ٹھہرا تمہیں کیا خطرہ ہے کہنے لگے۔ میاں پکڑ دھکڑ کے دنوں میں دعوے، دلیلیں نہیں چلتیں۔

اختر کی یاد میں

جو ۲۰ر دسمبر ۱۹۵۸ کی طوفانی صبح کو
دوستوں اور عزیزوں سے رخصت ہوگیا

فیض احمد فیض	عبدالحفیظ کاردار
فخر ماتری	میجر ابن الحسن
سلطان احمد	سابق میجر محمد اسحاق
مختار زمن	طفیل احمد جمالی
سید بادشاہ حسین	حمید اختر
قیصر حسنی	عزیز

عبداللطیف خاں کشتہ

والدۂ اختر	ڈاکٹر وحید الدین
سعیدہ حلیم	نسیم وحید

مرتبہ :- ابن انشا

منجانب
ڈاکٹر محمد سرور ایم بی۔ بی ایس
ایجوکیشنل پریس میں چھپا
مقام اشاعت
۲/۱۳۷ فاطمہ جناح کالونی ۔ کراچی

ترتیب

اس کی یاد میں	مرتب	۴
نوحہ	فیض احمد فیض	۱۵
قطعۂ تاریخ	قیصر حسنی	۱۶
دُور نگر کے بنجارے	ابن انشا	۱۷
کرکٹ کا دوست	عبدالحفیظ کاردار	۲۰
بلند و بالا اختر	فخر ماتری	۲۲
وداعِ دوست	میجر ابن الحسن	۲۸
ساتھی کی موت	سلطان احمد	۳۵
ہم نشین دل	(سابق میجر) محمد اسحاق	۴۴
جواں تھا ابھی اختر	مختار زمن	۵۰
اختر: خاموش طوفان	طفیل احمد جمالی	۵۵
دوست اور ساتھی	سید بادشاہ حسین	۶۳
تاریک شہر	حمید اختر	۷۲
حیات اختر	عبداللطیف خاں کشتہ	۷۹
میرا لاڈلا	والدۂ اختر	۹۲
اختر کی یادیں	ڈاکٹر وحید الدین	۹۹
بڑے بھائی	سعیدہ حلیم	۱۱۰
بڑے ماموں	نسیم وحید	۱۲۷

اُس کی یاد میں

کراچی کی فاطمہ جناح کالونی کے اندر ایک مکان ہے بظاہر آباد بباطن ویران اس کے مکینوں کے دلوں کی جوت بجھ چکی ہے وہ چلتے پھرتے راکھ کے ڈھیر ہیں فقط اندرونی تہوں میں ایک گرمی ایک تپک ہے۔ ایک متاعِ گم شدہ کی یاد کی — ایک عزیز کی جس کا نام پھاٹک پر موجود ہے "محمد اختر" لیکن جو اس گھر کی چار دیواری سے سال بھر پیشتر رخصت ہو گیا۔ یہ لوگ جانتے ہیں کہ وہ لوٹے گا نہیں لیکن ان کی نگاہیں درد اور شفقت سے سامنے کے دروازے پر جمی رہتی ہیں جو کبھی بند نہیں کیا جاتا —

نہ جانے کس لئے اُمید وار بیٹھے ہیں
اک ایسی راہ پر جو تیری رہ گزر بھی نہیں

۱۹۵۸ کے نومبر کی بات ہے۔ لاہور سے ایک عزیز دوست، جو نامور ادیب بھی ہیں ایک عجیب اور سنگین معاملہ لے کر کراچی آئے۔ ان کے ایک دوست نے جو ادیب بھی تھے جوانی کی دیوانگی میں کسی پر وار کر دیا تھا، جو مہلک ثابت ہوا۔ بہر حال عدالت میں جرم ثابت ہوا اور موت کی سزا ملی۔ یہ سزا اُوپر کی عدالتوں میں بھی برقرار رہی حتیٰ کہ صرف ایک چارۂ کار باقی رہ گیا — صدر مملکت سے اپیل۔ عزیزوں نے حسب قاعدہ رحم کی اپیل کی — ہمارے دوست نے اپنے جذبۂ دوستی سے ایک متوازی راہ عمل سوچی وہ یہ کہ ایک رحم کی اپیل اُدیبوں اور صحافیوں کی طرف سے بھیجی جائے۔

اپیل لکھی گئی اور بابائے اُردو عبدالحق سے دستخطوں کا آغاز ہوا۔ اسے پریس کلب میں لے جانے والوں میں میں بھی تھا — اختر بہت دنوں سے کہہ رہے تھے کہ تم پریس کلب نہیں آتے — میرا کلب میں جانے کا یہ پہلا دن تھا۔ اختر ملے اور بہت افسوس کرتے رہے۔ جرم و سزا اور عدالت و قانون سے الگ ہمارا نقطۂ نظر فقط انسانی تھا ایک جوان کی زندگی اور اس کے متعلقین و لواحقین کے جذبات کا سوال تھا۔ میرے سامنے اب تک اختر کے دستخط ہیں — اُردو میں کئے تھے۔ آن کی آن میں اُس نے دوسرے صحافیوں سے بھی دستخط

کرا دیئے اور ہمیں رخصت کرتے ہوئے کہا۔ "خدا کرے یہ شخص بچ جائے
اس کی ماں کا کلیجہ ٹھنڈا رہے"۔

وہ شخص پھانسی کی رسّی سے بچ گیا رحم کی اپیل منظور ہو گئی اور
اس کی ماں کا کلیجہ ٹھنڈا ہو گیا — اختر کو بچانے کے لئے تو میں دس
لاکھ بلکہ دس کروڑ دستخط کرانے کے لئے شہروں شہروں، بلکہ دیس
دیس گھومنے کو تیار تھا۔ بابر نے ہمایوں کی بیماری اپنے سر لے لی
تھی۔ اختر کے دوست اور عزیز بھی اتنی قربانی کے اہل تھے لیکن نہ
اس قربانی کا موقع دیا گیا نہ عزیزوں کی دل سوز دعاؤں کا محضر
قبول ہوا۔ مشیت کی یہ رمزیں ناقابل فہم ہیں۔ لوگ ایسے موقعوں پر
صبر کی تلقین کرتے ہیں۔ ایسے عالم میں صبر تو نہیں ہو سکتا جبر ہو سکتا
ہے۔ ایسا جبر جو انسان کے دل کی گہرائیوں میں ایک زہر چھوڑ جاتا
ہے۔

۲۰ دسمبر کی شام کا ذکر ہے۔ میں دوپہر دفتر سے آکر لحاف میں گھس
گیا تھا صبح سے بارش ہو رہی تھی ہر طرف کیچڑ تھا۔ ٹھنڈی ہوا تھی —
سردی تھی — یہ باہر قدم رکھنے کا دن نہ تھا۔ میں نے وقت دیکھنے کے

لئے ریڈیو کھولا تو کراچی کی خبریں ہو رہی تھیں — کچھ خبریں ہو چکی تھیں۔ لیکن وہ خبر اب ہو رہی تھی۔ میں بہت دنوں سے اختر سے نہ ملا تھا۔ اس کی بیماری کی خبر اس کے روز کے ملنے والے دوستوں کو رہی ہوگی — لیکن مجھے معلوم نہ تھی ریڈیو نے کہا — "کراچی کے مشہور صحافی محمد اختر آج صبح ہسپتال میں انتقال کر گئے" — آنکھیں دیوار پر جمی کی جمی رہ گئیں۔ چونکہ یقین نہ آیا تھا۔ اُردو کے بعد انگریزی خبروں کا انتظار کیا۔ اس میں بھی یہی خبر تھی۔ کوئی پانچ منٹ تو میں بالکل پتھر بنا پڑا رہا۔ اس کے بعد آنسوؤں کی دھار بہہ نکلی۔

کچھ یاد نہیں کس سن میں کافی ہاؤس میں دو لمبے تڑنگے متبسم دوستوں سے ملاقات ہوئی جن کو میں نے کراچی میں ہمیشہ اکھٹے ہی پایا — اختر اور زوّار۔ اختر زیادہ کشیدہ قامت تھا، زیادہ متبسم اور زیادہ دلنواز — ڈان میں کام کرتا تھا۔ پھر دوستی زیادہ بڑھی۔ لیکن دن رات یکجائی قسم کی نہیں۔ ایک دوسرے کی ٹانگ بھی ہمیشہ کھینچتے۔ وہ میری شاعری کے متعلق کہتے تھے۔

"کیا بوگس لکھتے ہو؟"

میں ان کا منہ چڑاتا تھا — اور کسی بات پر نہیں تو اسی پر کہ ۲۹ کو

انتیس کے بجائے پوربی محاورے میں 'اُنتیس' کہتے تھے۔ جب محفل جمتی تھی لمبی جمتی تھی اور خوب جمتی تھی۔ ان کے گھر پر (جن دنوں وہ ڈاکٹر وحید الدین صاحب کے ہاں رہتے تھے)۔ یا میرے گھر پر کم کم ——— کافی ہاؤس میں زیادہ۔ چھوٹے بھائی سرور کراچی کے طالب علموں کے بے تاج بادشاہ ہونے کی حیثیت سے مشہور رہتے تھے۔ لیکن ان سے ملاقات کئی برس بعد ہوئی۔ ۱۹۵۴ء میں ایک دن ایسا ہوا کہ میں ان کے گھر پر گیا اور باغیچے میں سے آواز دی ——— اُوپر سے نوکر نے کہا ——— "ابھی آتے ہیں"۔ اتنی راہ دکھانا خلافِ دستور تھا۔ یا اُوپر بلا لیتے تھے یا نیچے آجاتے تھے۔ تھوڑی دیر میں برآمد ہوئے۔ اچھے دُھلے دُھلائے قاعدہ کے کپڑے پہنے ہوئے ——— کہنے لگے ——— اخاہ ——— تم نے مجھے ناحق پریشان کیا نام بتا دیا ہوتا ——— میں نے کہا ——— خیر باشد ——— کہنے لگے۔ چند دن ہوئے ایک صاحب آئے تھے۔ سرور کو بُلایا وہ اسی طرح میلی قمیص اور پاجامہ میں بلا شیو کئے ملنے چلا گیا۔ اسی حالت میں پکڑ لے گئے۔ میں سمجھا کہ میرا نمبر آگیا۔ میں نہیں چاہتا کہ اس نادیدنی حالت میں پکڑا جاؤں اس لئے ہمیشہ تیار ہو کر آتا ہوں۔

میں نے کہا ——— سرور تو طالب علموں کا نیتا جی ٹھہرا تمہیں کیا خطرہ ہے کہنے لگے۔ میاں پکڑ دھکڑ کے دنوں میں دعوے، دلیلیں نہیں چلتیں۔

ایں ہمہ بچۂ شتر است، کہہ کر کسی کو بھی پکڑا جا سکتا ہے۔

میں نے کہا۔ تمھارے بچۂ شتر ہونے میں کلام نہیں لیکن ایسی بھی کیا دھاندلی ہوگی۔ چنتا مت کرو۔

اس کے دوسرے تیسرے دن اختر پکڑا گیا۔ اور اسی جرم میں۔ جیل میں اس نے اپنی گرفتاری کی وجوہ طلب کیں تو سرکاری جواب کا ماحصل یہ تھا

"تم سرور کے بھائی جو ہو"

اختر کا نوحہ جو بعد ازاں لیل و نہار اور امروز میں ایک ہی دن چھپا اور پھر کئی جگہ نقل ہوا۔ میں نے عجب بے صبری اور رقت کے عالم میں لکھا ہے مجھے اس پر تعجب ہے کہ میں نے لکھ لیا کیونکہ اب اتنا وقت گزر جانے پر بھی اختر کے بعض دوستوں کی یہ کیفیت ہے کہ لکھ نہیں سکتے۔ قلم ان کے جذبات کا ساتھ نہیں دے سکتا ــــ اختر کی رحلت کے بعد مہینوں مجھے اختر کے گھر جانے کی ہمت نہ ہوئی۔ میں اس کی والدہ اور شفیق والد ــ دو درسیدہ بہنوں اور مہجور بھائی کا سامنا نہ کر سکتا تھا۔ تیسرے روز خط ضرور لکھا کہ "سرور مجھے معاف رکھنا۔ تم مجھے میرا اختر واپس نہیں دلا سکتے میں تمہیں تمھارا اختر نہیں دے سکتا۔ میں تو اختر کا دوست تھا۔ تم اس کے

بھائی بھی ہو۔ دوست بھی۔ عاشق بھی۔ آنے کو تیار ہوں لیکن یہ درد بٹے گا نہیں"۔۔۔ نوحہ لکھنے کے بعد بھی اختر کے گھر کے کسی فرد سے ملاقات نہ کی ایک روز سردر میرے دفتر کے سامنے کی گلی میں مل گئے۔ میں نے معمولی سلام دعا کی یہ ذکر چھیڑنے کی ہمت کبھی نہ ہوئی۔۔۔ آخر ایک روز ہارون سعد مجھے پکڑ لے گئے۔ مولوی عبداللطیف خاں صاحب کشتہ جنہیں اس گھرانے سے ربط خاص ہے۔ اختر کی پہلی برسی پر ایک یادگاری کتاب شائع کرنے کا منصوبہ تیار کر کے لائے تھے۔ خود کچھ لکھنے اور باہمی دوستوں سے یادگاری کلمات لکھوانے کا بار میرے سر ڈالا گیا۔ اختر کی محبت ہے کہ یہ کام کشتہ صاحب کے منصوبے کے مطابق میرے ہاتھوں انجام پا گیا ورنہ میں ایسے کاموں میں بیشتر ناکام رہتا ہوں۔ لہٰذا ذمہ داری بھی نہیں سنبھالتا۔ اب اس کتاب میں اُس بچپنے کے تمام آبدار پہلو چھلک رہے ہیں۔ ماں کے آنسو۔ بہنوں کا درد۔ دوستوں کے دل کا گداز۔ ابھی کتنے ہی دوست ہیں جن کے مضمون کسی نہ کسی مجبوری کی وجہ سے اس مجموعے میں شامل نہیں ہو پائے۔ جن کے مضمون میں حاصل کر پایا اُن میں سے کسی کو میرے شکریے کی حاجت نہیں۔ حتیٰ کہ اختر کے اور ہم سب کے محبوب شاعر فیض صاحب تک نے اختر کے متعلق قطعہ بھیجتے ہوئے لکھا کہ "آپ لوگوں کی اظہارات غیر ضروری ہیں۔ اختر مرحوم مجھے خود عزیز تھے"۔ کاردار صاحب اپنی پرخلوص

تحریر دینے کے لئے خود امروز کے دفتر آئے۔ دوسرے دوستوں نے بھی یہی کیا اختر یار عزیز! اتنے اور ایسے دوستوں کے ہوتے تجھے جانے کی کیا جلدی تھی۔

اس مجموعے میں ایک حصّہ مرحوم کے ان خطوط کا ہے جو انھوں نے اپنے زمانہ نظر بندی میں کراچی جیل سے لکھے۔ ان خطوط میں اختر کی ذات صاف جھلک رہی ہے۔ وہی خلوص۔ وہی بے تکلفی۔ وہی شگفتگی اور کھلنڈرا پن۔ بہنوں اور بھانجوں سے کیا مزے مزے کی باتیں ہو رہی ہیں۔ ایسے میں بھی چہلوں سے باز نہیں آتے اور ان کے کتّوں بلّیوں کھیلوں تماشوں سب کی خبر رکھتے ہیں۔ میں نے اختر کو کبھی افسردہ نہیں دیکھا۔ وہ مجھ سے افسردہ دلوں کا ہمیشہ خاکہ اُڑایا کرتے۔ ذرا دیکھئے ان خطوط میں کیا جہان رنگ و بو آباد ہے — "انیس ہاشمی اور حنا کمسار بہترین سپورٹسمین چُنے گئے ہیں۔ ہم لوگ آپس میں ایک والی بال میچ بھی کھیل رہے ہیں۔ اُمید ہے میچ بہت دلچسپ ہوگا۔ افسوس کہ کراچی کے لوگ اسے نہ دیکھ سکیں گے۔ جیتنے والی ٹیم کو 'ہاشمی میموریل کھیر' کھلائی جائے گی۔" (انیس ہاشمی صاحب مشترکہ باورچی خانے کے منتظم بھی تھے)۔

"اس وقت سیل سے دھان کوٹنے کی سی آواز آ رہی ہے پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ یہاں دھان کہاں۔ یہ صاحب سیل میں صبح کی

کسرت کر رہے ہیں، ہم نے روزانہ اسی قسم کی آواز سنی تو سخت متحیر ہوئے آخر پتہ چلا کہ اپنی ذہنی تانگ کی کسرت فرماتے ہیں۔ اس پر کمبل لپیٹ لیتے ہیں اور چارپائی پر پٹختے ہیں۔

"اکنامکس میں اپنی دلچسپی کچھ واجبی سی ہے۔ پچھلے دنوں ایک بڑی ثقیل سی کتاب اکنامکس کی آئی۔ اسے اس وقت پڑھتا تھا۔ جب سونے کو جی چاہ رہا ہو اور نیند نہ آ رہی ہو۔ بس کوئی دس صفحے پڑھے اور نیند آگئی۔ بھائی صاحب (ڈاکٹر وحید الدین صاحب) کو بتا دو کہ نیند کی گولیاں تشخیص کرنے کی بجائے مجھ سے دو ایک ایسی ہی کتابوں کے نام پوچھ لیں۔ بڑی کارگر ثابت ہوں گی۔"

"زندگی اچھی خاصی گزر رہی ہے۔ اب کچھ بھیڑ بھاڑ بھی کم ہو گئی ہے۔ شام کو برات کا سماں نہیں ہوتا بلکہ شریفوں کی بستی معلوم ہوتی ہے ہاں اگر لوگ یونہی جاتے رہے تو جنگل کا سناٹا چھا جائے گا۔ بس اُلّو کی کسر رہ جائے گی۔ اس وقت ارشاد (بھانجا) بہت یاد آئے گا"

"گلاب کی قلم لے آؤ تو یہاں لگائیں چھوٹا سا باغیچہ ہو تو اس جگہ کا اُجاڑ پن ختم ہو۔ ویسے بھی فن باغبانی میں کچھ شُدبُد ہو جائے تو ممکن ہے آئندہ کام آئے"

میں نے جو اختر دیکھا وہ ہمیشہ خوش پوش تھا۔ نفیس طبع۔ خرچ میں دریا دل۔ مجھے کبھی خیال نہ آیا کہ یہ شخص اپنی صحافت کی مزدوری اپنی ماں کے ہاتھوں میں جا کر دیتا ہے جسے ایک بڑے گھر کا خرچ چلانا پڑتا ہے۔ بچوں کی کالج کی فیسیں دینی پڑتی ہیں۔ اختر کی تنخواہ آج کل کی گرانی کے عالم میں ان باتوں کی بمشکل ہی کفایت کر سکتی ہوگی لیکن اختر کے حال احوال سے یا باتوں سے کبھی اس کا اظہار نہ ہوا، وہ خوش باش اور کھلنڈرا مشہور تھا اور واقعتہً بھی تھا۔ لیکن اس کا دل انتہائی دردمند واقع ہوا تھا۔ اماں سے کہو پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ میں یہاں بالکل ٹھیک ہوں" کاش اسے اماں کی اس وقت کی پریشانی کا اندازہ ہو سکتا۔ کاش وہ سرحد وجود سے دل ریش عزیزوں کی ڈھارس کے لئے ایسا ہی پیغام بھیج سکتا۔ کراچی جیل اختر کے گھر کے چند فرلانگ دور ایک آباد جگہ پر واقع ہے۔ ایک روز اختر نے لکھا۔

"اس وقت یہاں بسوں اور کاروں کی آواز آ رہی ہے۔ دیکھئے باہر کی دنیا سے اس قدر قرب کے باوجود ہم کتنے دور ہیں" اختر کی ابدی آرام گاہ پُرشور آبادی سے اور زیادہ قریب ہے لیکن وہ اتنے قرب کے باوجود ہم سے کتنی دور ہے۔ اختر سرحد زیست کو پار کر کے زمان و مکاں کی نامعلوم پہنائیوں میں گم ہو گیا ہے۔ اس کے باوجود ہم سے کتنا قریب

ہے۔ ایسی کتاب تو پھر نہیں چھپے گی لیکن اے اختر ــــ

ہم یاد کی روشن شمعوں سے اس دل میں اُجالا رکھیں گے
اس سینے میں آبادی کا سامان نرالا رکھیں گے
تم اجنبی اجنبی راہوں میں، جب تھک جاؤ اک کام کرو
اِس دل میں آن قیام کرو، اس سینے میں بسرام کرو

ابنِ انشا

پاکستان آرٹ کونسل
الحمرا
دی مال۔ لاہور
۲۹ر دسمبر ۵۹ء

عزیزی ابن انشا صاحب!

اختر مرحوم مجھے خود عزیز تھے اس لئے آپ لوگوں کی سفارشات قطعی غیر ضروری ہیں۔ جی چاہتا ہے اطمینان سے کچھ لکھوں لیکن فراغت اور دلجمعی کی کوئی صورت دکھائی نہیں دیتی۔ دو شعر بھیجتا ہوں۔ بحر میں تصرف کا جواز تم خود تلاش کرو۔ مجھے یونہی اچھا لگا اس لئے ایسے ہی لکھا۔ دوسرے اور چوتھے مصرعے میں ایک رکن زیادہ ہے تو کیا ہوا۔ کیفیت کا تقاضا یہی ہے۔

نوحہ

نہ دید ہے نہ سخن، اب نہ حرف ہے نہ پیام
کوئی بھی حیلۂ تسکیں نہیں اور آس بہت ہے
اُمید یار، نظر کا مزاج، درد کا رنگ
تم آج کچھ بھی نہ پوچھو کہ دل اُداس بہت ہے

فیض

قطعۂ تاریخ

دوستاں را رفیق دیاور رفت
انجمن را عزیز و رہبر رفت
گفت ہاتف برائے مرگِ جواں
وائے آہ و بکا کہ اختر رفت

۱۹۵۸ء

قیصر حسنی

گلشن میں بہار کا سماں ہے
اے سرو بلند تو کہاں ہے

''اپنا تو بس یہی ہے''

اختر کا ایک خاص موڈ

ابن انشا

اے دُور نگر کے بنجارے

اے دُور نگر کے بنجارے، کیوں آج سفر کی ٹھانی ہے
یہ بارش، کیچڑ، سرد ہوا اور راہ کٹھن انجانی ہے
آ محفل چُپ چُپ بیٹھی ہے، آ محفل کا دل شاد کریں
وہ لوگ کہ تیرے عاشق ہیں، کے روز سے تجھ کو یاد کریں
وہ ٹھور ٹھکانے ڈھونڈ چکے، وہ منزل منزل چھُو آئے
اب آس لگائے بیٹھے ہیں، کب دستک ہو، کب تو آئے
اے دُور نگر کے بنجارے! اگر چھوڑ کے ایسے جانا تھا
کیوں چاہ کی راہ دکھائی تھی، کیوں پیار کا ہاتھ بڑھانا تھا

ہے دُنیا کے ہنگاموں میں، رنگینی بھی، رعنائی بھی
ہر چیز یہاں کی پیاری ہے، محرومی بھی، رُسوائی بھی
سب لوگ یہاں پر قسمت کے بے طور تھپیڑے سہتے ہیں
پر جیتے ہیں اور جینے کی اک آس سے چمٹے رہتے ہیں
اور تُو تو ایک کھلاڑی تھا، کیوں کھیل ہی سے منہ موڑ لیا
کیوں جان کی بازی ہار گیا، کیوں عمر کا رشتہ توڑ لیا
گو جانے کے مشتاق یہاں ہم جیسے لاکھ بچارے ہوں
وہ لوگ ہی رخصت ہوتے ہیں جو لوگ کہ سب کے پیارے ہوں

. . . . . .

ہر سال رُتوں کی گردش سے جب بیس دسمبر آئے گی
یہ اشک چھما چھم برسیں گے، یہ آہ گھٹا بن جائے گی
تم عرش کے ایک فرشتے تھے، جو فرش کی چوکھٹ چوم گئے
تم تیس برس تک دُنیا میں معصوم رہے، معصوم گئے
ہم یاد کی روشن شمعوں سے اس جی میں اُجالا رکھیں گے
اس سینے میں آبادی کا سامان نرالا رکھیں گے
تم اجنبی اجنبی راہوں میں جب تھک جاؤ، اک کام کرو
اس دل میں آن قیام کرو، اس سینے میں بسرام کرو

اس جگ کی رات اندھیری میں اک تارا تھا وہ ڈوب گیا
اور وعدے ساتھ نبھانے کے سب بھول بھلا کر خوب گیا
یہ انشا، ہارون، زید بکر، شیشوں کا مسیحا کوئی نہیں
سب دوست ہمارے اچھے ہیں، پر کون ہے اس سا کوئی نہیں
کیوں نازک نازک سینوں پر تم غم کا توڑ پہاڑ چلے
کیوں جگ کے کھیل تماشوں کا تم روپ سروپ اُجاڑ چلے
پھر دیکھ زمیں پر کیچڑ ہے، پھر دیکھ فلک پر پانی ہے
اے دُور نگر کے بنجارے، کیوں آج سفر کی ٹھانی ہے

عبدالحفیظ کاردار

کرکیٹ کا دوست

اختر سے میری ملاقات پہلے پہل کراچی میں ۱۹۵۳ میں ہوئی۔ اس وقت تک کرکیٹ میں میرا اپنا مستقبل غیر یقینی تھا۔ ان دنوں ایک ایسی افسوسناک بحث چھڑ گئی تھی جو پاکستان میں کرکیٹ کی نشوونما کے لئے نیک فال نہ تھی۔ اخبار نویس اس وقت تک اپنے کالموں میں اگر کرکیٹ کے متعلق کچھ لکھتے تھے تو فقط میچوں کی رپورٹنگ کی حد تک۔ اس کھیل کی تنظیم اور قیادت کے بارے میں کسی نے کوئی بحث نہ اُٹھائی تھی۔ اس مرحلے پر اختر مجھ سے ملا اور کہا —— کہ میں کرکیٹ کو تباہی سے بچانے کے لئے میدان میں آؤں گا اور اس بحث کو اُٹھاؤں گا —— اختر نے جو کہا تھا وہی کچھ کر دکھایا۔ جی جان سے یہ لڑائی لڑی اور جیتی اور یوں اس کی بدولت اس ملک میں کرکیٹ کو حیاتِ تازہ ملی۔

اختر نے جو موقف اختیار کیا اس سے ثابت ہو گیا کہ وہ حق کو پہچانتا اور اس کی قدر کرتا تھا۔ یہ کہنا بجا ہوگا کہ کریکٹ کو اس نازک موڑ سے بچا کر سلامتی کی منزل تک پہنچانے میں اختر کا حصہ کسی سے کم نہ تھا۔

کریکٹ کے میدان میں ہم ایک دوسرے کے ہمدوش کام کرتے رہے۔ چند سال بعد بدقسمتی سے باہم ایک غلط فہمی در آئی لیکن ہمارے باہمی اختلاف کے باوجود کریکٹ کے بارے میں اس کا نقطۂ نظر برابر معروضی رہا۔ اس میں جذبات کبھی دخیل نہ ہوئے۔ یہ غلط فہمی بھی جلد ہی دُور ہو گئی اور ہمارے دوستانہ تعلقات پھر بحال ہو گئے۔

اختر کی موت کو میں صحافت کے لئے ہی نہیں بلکہ پاکستانی کریکٹ کے لئے بھی نقصان عظیم سمجھتا ہوں موت نے اس فن شریف سے اس کا ایک مخلص دوست چھین لیا۔

اے۔ ایچ۔ کاردار

۱۱ جنوری ۱۹۶۰ء

فخر ماتری
مدیر اعلیٰ ملت ولیڈر

بلند و بالا اختر

وہ غلام محمد کا دور تھا۔ ناظم الدین وزارت کو برطرف کیا جا چکا تھا اور محمد علی بوگرا کو واشنگٹن سے بلوا کر وزیر اعظم بنا دیا گیا تھا۔ پیرزادہ عبدالستار کو بھی ناظم الدین کے ہمراہ مرکزی وزارت سے برطرف ہونا پڑا تھا۔ ناظم الدین وزارت کی برطرفی کے اسباب میں ایک سبب ملک کی نازک غذائی صورت حال بتایا گیا تھا اور چونکہ پیرزادہ عبدالستار مرکز میں وزیر خوراک تھے اس لئے انہیں بھی لازماً برطرف ہونا پڑا تھا۔ لیکن اس کے بعد پیرزادہ عبدالستار صاحب دوبارہ غلام محمد کا اعتماد حاصل کر کے سندھ کے وزیر اعلیٰ کے عہدے پر جا براجے تھے۔

پاکستان کے ایسے غیر مستقل سیاسی حالات میں پیرزادہ عبدالستار

نے سندھ میں بمقام بھیٹ شاہ ایک فنی و ادبی اجتماع منعقد کیا تھا۔ یہ اجتماع سندھ کے مشہور صوفی شاعر شاہ عبداللطیف بھٹائی کے عرس کے موقع پر منعقد کیا گیا تھا اور حکومت سندھ نے اس اجتماع میں شرکت کی غرض سے کراچی و سندھ کے اخبار نویسوں کو خاص طور پر مدعو کیا تھا۔ میں بھی اپنے پیارے دوست مجید لاہوری مرحوم کے ہمراہ اس اجتماع میں شرکت کرنے کی غرض سے بھیٹ شاہ پہنچ گیا تھا۔

تقریباً چھ سال پہلے کا یہ واقعہ بھی میرے لئے بڑا کارآمد ثابت ہوا اس وقت میں گجراتی اخبار 'ملت' چلا رہا تھا۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ ایک انگریزی اخبار کے اجرا کی اسکیم بھی میرے زیر غور تھی۔ اس انگریزی اخبار کے لئے مجھے چند جفاکش و دیانتدار اخبار نویسوں کی تلاش تھی۔ اس قسم کے میلوں ٹھیلوں میں کراچی کے نوجوان اخبار نویسوں سے ملاقاتیں ہوتیں۔ میں انہیں قریب سے دیکھتا پرکھتا اور اپنے نئے انگریزی اخبار کے لئے کون زیادہ موزوں ثابت ہوگا اس کا اندازہ کرتا۔

بھیٹ شاہ کے اس میلے میں اپنے انگریزی اخبار لیڈر کے لئے دو اخبار نویس میری نظروں میں جچ گئے تھے۔ یہ راز صرف میں جانتا تھا۔ دل کی بات میں نے دل ہی میں چھپا رکھی تھی۔ ان دو اخبار نویسوں میں سے ایک کا نام ہے سلطان احمد اور دوسرے کا نام ہے محمد اختر!

سلطان احمد ان دنوں اے پی پی میں کام کر رہے تھے اور اختر میرے دوست جناب سلیری کے اخبار ٹائمز آف کراچی میں خصوصی رپورٹر کے فرائض انجام دے رہے تھے۔

اس واقعہ کے تقریباً ساڑھے چار سال بعد میں نے لیڈر اخبار جاری کیا۔ سلطان احمد کو میں نے ایڈیٹری کے فرائض سپرد کئے اور اختر کو نیوز ایڈیٹری کے اور ساڑھے چار سال قبل کیا ہوا یہ انتخاب یوں عمل میں آیا۔ ان دونوں ساتھیوں کو میں نے بھیٹ شاہ کی 'بھیٹ' یعنی تحفہ کی طرح اپنایا۔

اشاعت پزیر ہوتے ہی لیڈر ایک مقبول و ممتاز اخبار بن گیا۔ اختر ایک طویل القامت نوجوان تھے۔ سندھ کے اس میلے میں ہزاروں لوگوں کے اجتماع میں بھی انہیں دور سے بہ آسانی دیکھا جا سکتا تھا سلطان درمیانہ قد کے جوان ہیں انہیں تلاش کرنا ذرا مشکل ہوتا ہے جس وقت لیڈر کے دفتر میں آکر اختر اپنی کرسی پر بیٹھے تو میں نے ہنس کر کہا، شام کے اخباروں میں لیڈر بھی اتنا ہی اونچا ہونا چاہیئے جتنا اونچا کراچی کے اخبار نویسوں میں تمہارا قد ہے۔

اختر ہنس پڑے۔ ہنستے ہوئے انہوں نے کہا "یقیناً ایسا ہی ہوگا"

لیڈر کی مقبولیت میں اختر کی جفاکشی کا بھی نمایاں حصہ ہے۔ تیز رفتاری اور تندہی سے کام کرنے کا جذبہ اور صدق دلی ان کی زبردست خوبیاں تھیں۔ ایسے بھی موقع آئے جب اختر کو پورا اخبار تیار کرنا پڑا۔ خود ہی خبریں فراہم کرتے خود ہی سرخیاں لگاتے، خود ہی اداریے لکھتے اور اندر کے صفحات کے لئے مختلف موضوعات پر مضامین بھی وہی لکھتے۔ پاکستان کے اخبار نویسوں کو شدید محنت کرنا پڑتی ہے اختر کو اس جفاکشی میں بھی لطف آتا تھا۔ دوسرے اخبارات سے جلد وہ لیڈر شائع کراتے۔ اکثر وہ دوپہر کو ایک بجے ہی کام ختم کر کے چل دیتے۔ مجھ سے کہتے "میرا آج کا کام ختم ہوا۔ اب اگر اخبار نکلنے میں دیر ہوئی تو یہ مشینوں کا قصور ہوگا"

اختر کے اونچے قد کے سلسلہ میں کئی لطیفے گڑھے گئے۔ اختر یہ لطیفے سُن کر کبھی ناراض نہ ہوئے۔ وہ جب کبھی موٹر رکشا میں بیٹھے تو دور سے دیکھنے پر یوں لگتا جیسے وہ بیٹھے نہیں بلکہ کھڑے ہوئے ہیں۔ ایک بار سیلاب کے موقع پر اختر بھی پہنچ گئے۔ وہ سیلاب کا آنکھوں دیکھا حال، لکھنا چاہتے تھے۔ کئی سرکاری افسران بھی ساتھ تھے۔ ایک افسر نے کہا۔ اختر تم جانتے ہو ہم تمہیں اپنے ہمراہ کیوں لائے ہیں؟" اختر نے فوراً جواب دیا "جی ہاں۔ یہ ناپنے کے لئے کہ سیلاب کا پانی کتنا چڑھا ہے" اور یوں

اختر نے ان سب کو ہنسایا تھا۔

لیڈر میں "ملاقات" نامی ایک کالم جاری کیا گیا تھا۔ اس میں اہم شخصیتوں کی ملاقاتوں کے احوال شائع کئے جاتے تھے۔ یہ فرض بھی اختر ہی انجام دیتے تھے۔ جب اس ملاقات لینے والے کے "تخلص" کا سوال زیر بحث آیا تو خود اختر ہی نے اس کا حل بھی پیش کیا۔ اختر نے اپنا نام "لانگ فیلو" پسند کیا۔ جاننے والے تو فوراً اس کالم نویس کو پہچان گئے۔

ایک روز اختر شام کو میرے پاس آئے اور بولے "آج ذرا جلد جانا چاہتا ہوں۔ کام ختم کر لیا ہے۔ کل شاید نہ آسکوں"

میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ اختر چل دیئے۔ مگر مجھے معلوم نہ تھا کہ وہ ہمیشہ کے لئے جا رہے ہیں۔ مجھے معلوم نہ تھا کہ اس کے بعد وہ پھر کبھی واپس نہ آئیں گے۔ کاش مجھے معلوم ہوتا کہ یہ ان کی اور میری آخری ملاقات ثابت ہوگی۔ یہ ہماری آخری گفتگو ثابت ہوگی۔

دو دن تک اختر نہ آئے۔ اس کے بعد اطلاع ملی کہ انھیں سردی لگ گئی ہے اور ہسپتال میں داخل کر دیا گیا ہے۔

اس کے دوسرے ہی دن دوپہر کو وہ دردناک اطلاع پہنچی کہ اختر انتقال کر گئے ہیں! میرے دماغ پر ایک شدید چوٹ لگی۔ میں شل ہو کر رہ گیا۔ پچھلے پندرہ سال سے میں اخبار نویس کی حیثیت میں کام کر رہا ہوں

میرے ساتھ کام کرنے والوں میں سے کسی کی موت واقع ہونے کا یہ پہلا حادثہ تھا۔ اور وہ بھی اختر جیسے جواں سال ساتھی کی موت! میں دل تھام کر رہ گیا۔ یوں جیسے میرا کوئی عزیز چل بسا ہو!

اختر کے انتقال کو آج ایک سال بیت چکا ہے پھر بھی جیسے میں سہنے کو تیار نہیں ہوں۔ وہ بلند و بالا قد، وہ پر شباب چہرہ کس طرح بھلایا جاسکتا ہے۔ لیڈر کے ایڈیٹوریل سیکشن میں جب کبھی میرا گزر ہوتا ہے تو مجھے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے اختر ادھر اُدھر ہو گئے ہیں مرے نہیں۔

مجرا ابن الحسن

وداعِ دوست

۱۴ر دسمبر کو اختر میرے گھر آیا مگر میں عسکری (ابن سعید) کے گھر پر برج کھیل رہا تھا۔ اور غلط کالنگس پر اپنا مذاق اُڑوا رہا تھا۔ اچھی طرح پٹ پٹا کر جب گھر واپس آیا تو معلوم ہوا کہ اختر مجھے کسی بڑی اچھی تقریب میں لے جانے کے لئے آیا تھا۔ برج اور عسکری دونوں پر لعنت بھیجی اور کافی دیر تک بیٹھا اکیلا سوچتا رہا کہ کاش خدا مجھے اپنے ہم جنسوں کے ساتھ رہنے کی توفیق دے۔

دوسرے دن اختر پھر میرے گھر آیا۔ دوپہر کا وقت تھا اور میں کراچی کی اپنی اس تنگ اور مختصر قیام گاہ میں سونے اور کچھ دیر آرام کرنے کی کوشش کر رہا تھا جہاں دن اور رات اس قدر شور و غل بپا رہتا

ہے کہ تھکن سے چور ہو کر بھی سونا ناممکن ہے۔ اختر نے میرے کمرے میں آتے ہی کوٹ اتار دیا اور کرسی پر نیم دراز ہو کر سب سے پہلا جملہ جو کہا یہ تھا کہ "بنجر زندگی کا یہ خلا کس طرح پر کیا جائے؟"

"کیا مطلب"؟ میں نے پوچھا

کہنے لگا "یار اب خود ہی سوچو کہ صبح سے شام تک خبروں کیلئے مارے مارے پھرنا۔ تیری میری خوشامد کرنا چھوٹے چھوٹے معمولی معمولی گھٹیا لوگوں کو برداشت کرنا اور پھر جب یہ سب چیزیں حد سے گذر جائیں تو نہ کوئی ساتھی نہ غم خوار نہ ہمدرد"——

میں نے کہا شادی کر لو کہنے لگا "چھوڑو بھی اپنی ہی لعنت اپنے لئے کیا کم ہے"

پھر کچھ دیر شادی کی افادیت، اہمیت اور ضرورت پر سنجیدہ اور غیر سنجیدہ قسم کی باتیں ہوتی رہیں۔ رات کو ہم دونوں سینما دیکھنے گئے اور اس کے بعد تین دن تک اس سے ملاقات نہیں ہوئی اس تمام عرصہ کراچی میں بڑی سخت بارش رہی بیس تاریخ کی شام کو ایک شادی کے سلسلے میں تقریب تھی بے شمار مرد بے شمار عورتیں اور بچے تھے۔ کسی سوشل سیکنڈل پر میں اور عسکری بے تحاشا لطف اندوز ہو رہے تھے۔ کمرہ ہمانوں، باتوں قہقہوں اور سگنڈلس سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ صبح قسم کی سوشل فضا

تھی۔ تمول۔ تحکم۔ خود اعتمادی۔ ہوا خواہی۔ خود نمائی اور گرمیٔ محبت۔ کہ یکایک عسکری، مختار زمن سے ایک کونے میں بات کر کے میرے پاس منہ لٹکائے ہوئے آئے اور چپکے سے کہا

"سُنا؟ اختر چل بسا"

"ہیں کون" میری بالکل سمجھ میں نہ آیا۔

"اختر اپنا اختر"

"نہیں نہیں"

عسکری کی آنکھوں میں آنسو رُکنے مشکل ہو رہے تھے۔ میں دھک سے رہ گیا۔ بارش اور شادی کی وہ تقریب اور مہمان اور ہر چیز بہت بُری۔ بڑی بے موقع حد درجہ بے ہودہ معلوم ہونے لگی۔ ایسا لگتا تھا جیسے یہ سب جو ہو رہا تھا اور وہ سب جو وہاں تھے اور ہر بات اور ہر چیز اپنی دشمن ہے۔ اپنے خلاف ہے اور جیسے یہ ساری تقریب اختر کی موت کا سبب ہے۔ حالانکہ اگر اختر اسی دن نہ مرا ہوتا تو وہ بھی اس میں شریک ہوتا اور ہم سے زیادہ زوردار قہقہے لگا رہا ہوتا۔ اور ہر سکینڈل میں ہم سے کہیں زیادہ دلچسپی لے رہا ہوتا پھر بھی دل ایک دم اتنا ڈوب گیا کہ اپنے اوپر رہ رہ کر غصہ آ رہا تھا کہ ابھی ابھی جو ہم ہنس رہے تھے وہ ہمارا کتنا بڑا جرم تھا اور کاش ہم سے یہ جرم سرزد نہ ہوا ہوتا۔

صرف پانچ دن اختر سے ملاقات نہیں ہوئی اور وہ رخصت بھی گیا۔ اتنا ہنس مکھ۔ اتنا خوبصورت اتنے اچھے ڈیل ڈول کا۔ ایسا ذہین اور محبت والا دوست ـــــ وہ جو سخت سے سخت فقرہ کہتا تھا تب بھی محبت اور خلوص کو ہاتھ سے نہ جانے دیتا تھا۔ اپنی مختصر سی زندگی میں ایک لمحہ بھی کسی کی برائی، یا کسی کی مخالفت میں ضائع نہیں کیا۔ جس نے اپنی زندگی وقف کر دی تھی تاکہ وہ کسی مقصد کی آدرش کو پروان چڑھا سکے پر جب اس جواں مرگی کے المیہ پر سنجیدگی سے غور کرتا ہوں تو یہ سوچے بغیر نہیں رہ سکتا کہ وہ مقصد اور وہ آدرش کتنا خام اور نامراد تھا۔ دراصل اختر کا سارا وقت اور ساری جد وجہد اس ایک مقصد کے لئے وقف ہو گئی تھی کہ وہ اپنے ساتھی صحافیوں کی خدمت کر کے ان کو خوش کر سکے۔ اس کے ذہن میں مستقبل کا کوئی ایسا تصور نہ تھا جو عام صحافیوں کا ہوتا ہے مثلاً وہ اگر چاہتا تو اخبار کی غیر محفوظ اور غیر مستحکم زندگی سے بآسانی چھٹکارا حاصل کر سکتا تھا۔ اس کی شخصیت اس کی اہلیت اور اس کی شہرت اس کی عمر کے لحاظ سے ایسی تھی کہ وہ سرکاری یا نیم سرکاری اداروں میں کہیں بھی نشر و اشاعت سے متعلق کوئی اچھی ملازمت حاصل کر سکتا تھا۔ اس کو سبھی تو پسند کرتے تھے۔ مگر وہ کارکن صحافی کی حیثیت کا نہ معلوم کیسا عجیب اور رومانوی تصوّر دل سے لگائے دن اور رات کراچی کی سڑکیں ناپتا پھرتا

تھا۔ اس میں عام صحافیوں کی طرح بلاوجہ اترانے کی بھی عادت نہ تھی اور نہ وہ ان کی طرح اپنے متعلق کسی خوش فہمی کا شکار تھا۔ وہ صحافی کی حیثیت سے اپنا یہ حق نہ سمجھتا تھا کہ دنیا کا ہر فرد اس کے سامنے ہیچ ہے اور اس وجہ سے کہ وہ ایک چھوٹے یا بڑے اخبار کا نامہ نگار ہے چنانچہ دوسرے سب لوگوں کی عمر، مرتبہ، تجربہ، رائے اور حیثیت اس کے لئے کوئی وقعت نہیں رکھتی۔ وہ اپنے ہم عمروں سے محبت اور خلوص برتتا تھا اور اپنے سے بڑوں کی اسی طرح عزت کرتا تھا جیسے اچھی تہذیب اور اچھی تربیت کے سایہ میں پروان چڑھے ہوئے ہونہار اور نوجوان کیا کرتے ہیں۔

اے ٹی نقوی صاحب کے "عہد" میں جو کچھ ہوا وہ کراچی شہر کی تاریخ کا کیسا بھی باب کیوں نہ ہو، مجھے اس سے غرض نہیں۔ جو گزر گیا خدا کا شکر ہے کہ گزر گیا، مگر میں پورے احساس ذمہ داری اور ایمانداری سے اس بات پر یقین کرتا ہوں کہ محض کافی ہاؤس میں بیٹھنے کی پاداش میں اور چھوٹے چھوٹے چھوٹے معمولی معمولی اہلکاروں کو منہ نہ لگانے کے جرم میں اختر کو اس زمانہ کی انتظامیہ نے محبوس کیا اور میں آج بھی خدا کو حاضر ناظر جان کر یہ دعوے کرتا ہوں کہ وطن دشمنی تو الگ رہی، اختر کا ذہن اور ذات تو کسی معمولی دشمنی کو بھی قبول کرنے کی متحمل نہ تھی۔ جہاں تک اس کے ریڈیکل خیالات کا تعلق ہے سو وہ تو اپنی اپنی جوانی میں ہر شخص کے

کے ہی ہوتے ہیں۔ اب اگر ایک ہونہار پڑھا لکھا خوش شکل، خوش گفتار، جامہ زیب، تہذیب یافتہ، وسیع النظر نوجوان کا بھی نہ ہو تو پھر آخر کیا ہو۔ کس طرح وہ اپنی ذہنی صلاحیتوں کو بلا دے یا پھر کس طرح وہ اپنے سیمابی تخیل کو شکنجہ میں کس دے۔

میرے خیال میں اختر کی سب سے بڑی خرابی اس کی خوبیاں تھیں۔ اسے تو کسی کی نظر کھا گئی اس اتنے بڑے کراچی شہر میں جہاں دن اور رات یکساں روشنی رہتی ہے، ہمیں تو ایک بھی ایسا آدمی نہیں دکھائی دیتا جو بغض اور کینہ سے بری ہو، جو اچھی بری باتوں، اچھے برے لوگوں کو خندہ پیشانی سے برداشت کر لے۔ یہاں کی یہ ریت ہی نہیں۔ پھر ایسے شہر میں اتنے کھرے سچے اور تحمل مزاج آدمی کے لئے زندہ رہنے کا کیا جواز تھا۔ خصوصاً اس صورت میں کہ کئی برس اس شہر میں رہ کر بھی اس نے یہاں کی عام روش کا کوئی اثر قبول نہ کیا۔

اختر اور زوار پاکستان کے دو بہترین اسپورٹس رپورٹر تھے۔ وہ دونوں اپنا ثانی نہ رکھتے تھے۔ دونوں ہی کو اپنے پیشے یعنی صحافت سے جو شغف تھا اس کی مثال ملنی مشکل ہے۔ دونوں بڑے گہرے دوست اور صاف ستھرے نوجوان تھے (زوار بغیر اختر کے اب مجھے اکیلا اکیلا سا لگتا ہے) اختر کراچی کے چھوٹے سے چھوٹے میچ میں بھی جاتا تھا۔ معمولی

سے معمولی کھلاڑی کو بھی سر آنکھوں پر بٹھاتا تھا۔ وہ اپنے پیشے کے ساتھ اتنا وفادار تھا کہ اپنے آرام اور اپنی ذاتی ضروریات کو بھی اس کے سامنے ہیچ سمجھتا تھا۔ اس کے ہم پیشہ لوگوں اور کاردار اور فضل محمود جیسے بڑے کھلاڑیوں پر بھی اس کی صلاحیتوں کی دھاک تھی۔ اختر کوئی معمولی آدمی نہ تھا البتہ وہ ایک غیر معمولی آدمی بننے سے پہلے مر گیا۔ بے چارہ اختر اور بے چارے اختر کے دوست۔

سلطان احمد

ایک ساتھی کی موت

موت آج بھی میرے لئے ایک انجانی سی چیز ہے میں موت سے سمجھوتہ نہیں کر سکتا۔ میری ایک دادی تھیں، ان کا انتقال اس وقت ہوا جب میں بہت چھوٹا تھا اور کسی کی جدائی کا احساس کرنے کے قابل نہیں تھا۔ بعد میں جب میرے والد فوت ہوئے تو اس وقت تک میں یہ سمجھنے کے قابل ہو چکا تھا کہ موت سے چھٹکارا ممکن نہیں ہے۔

لیکن بزرگوں کی موت نوجوانوں کو ایسا کوئی دیرپا صدمہ نہیں پہنچاتی جیسا اپنے کسی محبوب، کسی پیارے بچے، یا کسی قریبی ساتھی کی اچانک موت سے پہنچتا ہے۔ اس وقت ہم بڑی چبھن کے ساتھ یہ محسوس کرتے ہیں کہ وہ کچھ پیش آگیا ہے جو نہیں پیش آنا چاہیئے تھا، جس کے پیش آنے کی کوئی ضرورت نہیں تھی اور جو عام طور پر پیش آتا بھی

نہیں۔ اس وقت موت ہمیں اچانک خود اپنی سطح پر نظر آتی ہے، دور ماضی کی ایک یاد ہونے کے بجائے وہ ہمیں اپنے سامنے کھڑی نظر آتی ہے اور ہمیں زندگی کے اس المناک احساس پر قابو پانے کے لئے ایک عرصہ درکار ہوتا ہے۔

سال بھر پہلے جب اس نوعمر اخبار کے چیف ایڈیٹر اور میرے ساتھی محمد اختر کا اچانک اور بالکل غیر متوقع طور پر انتقال ہوا تو میرے ساتھ بھی بعینہٖ یہی صورت پیش آئی۔ یہی نہیں کہ ہم نے دو اخباروں میں عرصہ تک ساتھ کام کیا تھا، بلکہ میں اختر کو اس وقت سے جانتا تھا جب اس نے "ڈان" کے اسپورٹس رپورٹر کی حیثیت سے صحافت کی ابتدا کی تھی۔

کوئی ہنس مکھ ساتھی، قریبی دوست اور ہونہار صحافی جس کے سامنے ایک روشن مستقبل ہو۔ جس پر آدمی اتنا بھروسہ کرنے کا عادی رہا ہو اور جس نے زندگی کا پہلا اور سب سے کٹھن امتحانی دور ابھی ابھی ہی ختم کیا ہو اچانک چل بسے تو شدید صدمہ کا محسوس کیا جانا قدرتی ہے۔ یہ صدمہ اس وقت اور بھی زیادہ تلخ ہو جاتا ہے جب مرنے والا اختر کا جیسا نوجوان ہو، جسے اختر کی طرح ابھی اپنی ابتدائی جدوجہد کا کوئی پھل بھی نہ ملا ہو اور جس کی موت، اختر کی موت کی طرح ظالمانہ

حد تک غیر متوقع ہو۔ اختر کی جان لیوا بیماری اتنی اچانک آئی اور اتنی سُرعت سے اس کی زندگی کا چراغ گل ہوا کہ یہ جاننے کے باوجود کہ موت ناگزیر ہوتی ہے اور کسی وقت بھی آسکتی ہے، اس کے دوست اس حادثہ کے لئے کسی طرح تیار نہیں تھے۔

نمونیہ کا حملہ ہوتے ہی اختر کو فوراً اسپتال لے جایا گیا۔ دوسرے دن میں اسے دیکھنے گیا، اس کی حالت خراب تھی لیکن وہ خطرہ سے باہر ہو چکا تھا اور چونکہ اس کی دیکھ بھال کے لئے اسپتال کے ڈاکٹروں کے علاوہ گھر کے دو ڈاکٹر ——— چھوٹا بھائی ڈاکٹر سرور اور زیادہ تجربہ کار، بہنوئی ڈاکٹر وحید الدین ——— بھی موجود تھے اس لئے اور بہتوں کی طرح میں مطمئن ہو کر واپس آگیا۔

دوسرے دن میں نے سُنا کہ اس کی حالت پہلے سے اچھی ہے اور اُسے اسپیشل وارڈ میں ایک کمرہ مل گیا ہے۔ لیکن اس کے بعد اگلے روز ہی میں پھر اسے دیکھنے گیا تو اس کی حالت بہت خراب تھی دس بارہ اور دوست بھی اسے دیکھنے کے لئے آئے ہوئے تھے لیکن اختر کی پریشانی کے خیال سے کسی کو اس کے پاس نہیں جانے دیا گیا ہم سب اس دن خاصے پریشان واپس آئے، دوسرے روز صبح ہم یہ سُن کر بھونچکے رہ گئے کہ وہ دنیا سے رخصت ہو چکا ہے اور اس کی میت

گھر پہنچادی گئی ہے۔ ظاہر ہے کہ اس کے وہ دوست جو یہ سمجھ کر کہ خطرہ کی منزل گزر چکی ہے، اور اب وہ روبصحت ہے، دوبارہ اسے نہ دیکھنے نہیں گئے تھے، یہ اچانک خبر سُن کر اور بھی زیادہ دُکھی تھے۔

ایک سال کا عرصہ، اختر کی یادوں کے نقوش کو دُھندلا کرنے کے لئے بہت کم ہے۔ اب بھی ہمارے دفتر میں اس کا نام آجاتا ہے۔ تو یادوں کے دفتر کھل جاتے ہیں اور دفتر کا ہر شخص بچھڑے ہوئے ساتھی کی معیت میں بیتے ہوئے ایام کا تذکرہ کرنے لگتا ہے۔

اس کے بارہ میں میرا اپنا تاثر یہ ہے کہ وہ کام کرنے کے لئے بہترین ساتھی تھا۔ فہیم اور بے لوث، صلح جو، مکمل طور پر قابل اعتماد اور غیر معمولی حد تک معاون اور مددگار ـــــ یہ سب اس کی ایسی خصوصیات تھیں جن کی وجہ سے، شام کے اس نوعمر اخبار کو انتہائی مشکلات کے ہوتے ہوئے تیزی اور پھرتی کے ساتھ نکالنے کا دُشوار کام بھی دل چسپ اور آسان ہو گیا تھا۔

ہمارے اخبار کو جاری ہوئے ابھی تھوڑے ہی دن ہوئے تھے کہ مجھے پانچ ہفتہ کے لئے یورپ جانا پڑا۔ اس مدت میں اُسے پورا اخبار نکالنا پڑا۔ عراق میں اس زمانے میں گڑبڑ ہوئی تھی جس کی وجہ سے مستقل کئی روز تک اہم خبروں کا تانتا بندھا رہا۔ اختر نے نہ صرف

نیری کمی کو پورا کیا بلکہ بڑی عمدگی سے پورا کیا۔ اپنے ساتھیوں کے ساتھ اس نے اس طرح کام کیا کہ ان لوگوں نے بھی جنہوں نے برسوں سے ٹائپ رائٹر کو ہاتھ نہیں لگایا تھا، بڑے اچھے اچھے فیچر اور مضامین لکھ ڈالے۔ میں یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ ان میں ایسے ساتھیوں کے مضامین بھی تھے جنہوں نے مجھ سے خود کہا کہ ہم نے نہ پہلے کبھی لکھا ہے اور نہ مستقبل میں لکھنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔

ہمارے ملک میں اچھے صحافی بہت کم نظر آتے ہیں، لیکن وہ برابر ترقی کر رہا تھا اور روز بروز آگے بڑھ رہا تھا، اسے کسی وقت بھی سیکھنے سے کوئی عار نہیں تھا، نئے نئے شعبوں کی رپورٹنگ کا شوق تھا اور ضرورت پڑنے پر ہر کام کرنے کے لئے تیار تھا۔

اپنی موت سے کچھ عرصہ قبل، اس نے "لانگ فیلو" کے نام سے مشہور اور دل چسپ آدمیوں کے قلمی خاکوں کا ایک سلسلہ شروع کیا تھا۔ بہت سے لوگ یہ سمجھتے تھے کہ یہ قلمی نام اس کی اپنی تصنیف ہے کیونکہ وہ بذاتِ خود خاصا طویل قامت تھا، لیکن ایسا نہیں تھا، یہ نام اور اس اُمید میں رکھا تھا کہ اختر دفتر واپس آئے گا تو اپنے اس قلمی خاکے کے لئے خود ہی کوئی قلمی نام تجویز کرے گا، لیکن اختر دیر سے آیا اور اس کا لکھا ہوا پہلا خاکہ "لانگ فیلو" کے نام کے ساتھ اس کے سامنے

کوئی اعتراض نہیں کیا اور اس طرح چیف سب ایڈیٹر کا شرارت میں تجویز کردہ نام برقرار رہا۔ مجھے اس کے معترض نہ ہونے پر تعجب بھی ہوا لیکن کندھے کی خفیف جھٹک کے ساتھ اس نے یہ کہہ کر بات کو نظرانداز کر دیا کہ "سب ٹھیک ہے"۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اسے اپنے لمبے ہونے کا کوئی خصوصی احساس نہیں تھا۔

گرمیوں میں وہ بشرٹ اور پتلون پہنتا تھا اور سردیوں میں سوٹ لیکن ایک دو دن کے لئے جب اسے عید کے بعد لوگوں سے ملنے کے لئے جانا ہوتا تھا تو وہ شیروانی پہنا کرتا تھا۔ وہ اپنے بازو پھیلائے ہوئے ہم سے ملنے آتا تھا تو کوئی کہہ دیتا تھا کہ ایسے نہیں ملیں گے سینہ سے سینہ ملنا چاہیئے۔ اور مظاہرے کے طور پر ایک کرسی کھینچ کر اس پر چڑھ جایا کرتے تھے۔ اختر کہتا تھا اس طرح ملنے کی شرط نہیں پھر ہم نیچے اُتر آتے اور کرسی پیچھے ڈھکیل کر عام طریقہ سے ملتے۔

اختر دوستی سے بھرپور اور ایک محبت بھرے دل والا آدمی تھا لیکن ..... اور نمائشی لوگوں سے اسے سخت چڑ تھی۔ کچھ عرصہ پہلے تک ہمارے یہاں ایک بڑے افسر ہوا کرتے تھے جو جنسی جرائم میں ملوث تھے اور جن کا نام بھی اس سلسلہ میں اخباروں میں آچکا تھا۔ قدرتی طور پر یہ افسر "لیڈر" کو پسند نہیں کرتے تھے اس لئے کہ "لیڈر" نے

ان کی کچھ حماقتوں پر سے پردہ اُٹھا دیا تھا،

ایک سفارت خانے کی دعوت میں یہ افسر صاحب پاکستانی اخبارات کی برائیاں گنا رہے تھے اور مغربی اخباروں کے قصیدے پڑھ رہے تھے۔ ان کو یہ معلوم نہیں تھا کہ اختر بھی جو ان کی باتیں سُن رہا تھا صحافی ہے۔ اختر پہلے تو سب سنتا رہا پھر اس نے ان حضرت کی ایسی خبر لی کہ انھوں نے فوراً معافی مانگی اور خفت مٹانے کے لئے اختر سے لپٹ گئے۔ یہ صاحب بعد میں ملازمت سے نکال دیئے گئے اور آج کل کئی جنسی جرائم میں ماخوذ ہیں۔

اختر کا دل کمزور تھا اور انجام کار وہ اسی کا شکار ہوا تاہم اس کا یہ کمزور دل صحیح طور پر دھڑکتا تھا اور سب کی بھلائی کے لئے دھڑکتا تھا، وہ بجا طور پر حق کی تائید ـــــ مالکوں کے مقابلہ میں مزدوروں سابق حکمران ٹولی کے مقابلہ میں عوام اور زمینداروں کے مقابلہ میں کاشتکاروں کے لئے کمربستہ رہتا تھا۔ صرف یہی نہیں، جس مقصد کو وہ صحیح اور شریفانہ خیال کرتا تھا، اس کی خاطر کافی حد تک خطرات مول لینے کے لئے بھی تیار رہتا تھا۔

اس کے کردار میں حسد کا شائبہ بھی نہیں تھا۔ دوسروں کی خوبیوں کا اعتراف کرنے کے لئے وہ ہمیشہ تیار رہتا تھا، چاہے ایسے

لوگ اس کے حریف ہی کیوں نہ ہوں۔ ایک دفتر میں اس کے ایک جونیئر کو بلا پوچھے گچھے اس سے اُوپر کر دیا گیا۔ اختر کو حق بجانب طور پر اس سے تکلیف ہوئی لیکن اُسے کبھی کسی نے اس آدمی کے خلاف کچھ کہتے نہیں سُنا۔

ہمارے دور کے عام نوجوانوں کی طرح وہ بھی بڑا دل شکستہ تھا، اس نے اپنے عقائد کا مذاق اُڑتے دیکھا، لیکن ایک ایسے ماحول میں جہاں سیاست دانوں کو اپنے حریفوں پر کیچڑ اُچھالنے کی پوری آزادی تھی، اس کا قلم اپنے جذبات کے اظہار کے لئے آزاد نہیں تھا، وہ جیل گیا، لیکن جیل سے باہر آیا تو نہ اس میں کوئی تلخی تھی، نہ وہ مایوس تھا اور نہ بزدلی جیسے کسی احساس کا شکار۔

جوانی اسی وقت کچھ معنی رکھتی ہے جب وہ کسی مثبت کام کا حوصلہ رکھتی ہو، یہ نہیں کہ بے مقصد حیوانی خواہشات کی تسکین کیلئے زندگی ختم کر دی جائے۔ اگر نوجوان زندگی کی اعلیٰ قدروں اور اعلیٰ تصورات سے ہم آہنگ زندگی کا مذاق اُڑائیں اور فوری حصول کے لئے صرف مصلحت کوش ہو کر رہ جائیں تو دنیا میں سماجی ترقی ناممکن ہو جائے۔ اختر ہمارے زمانہ کی مستثنیات میں سے تھا اور ان تمام پیاری خصوصیات کا حامل تھا جو بہترین زندگی کا تصور رکھنے والے نوجوانوں

میں پائی جاتی ہیں۔ اگرچہ موت اُسے ہمیشہ کے لئے ہم سے چھین چکی ہے لیکن اس کی یہ پیاری خصوصیات، اس کی یاد کو عرصہ تک ہمارے ذہنوں میں تازہ رکھیں گی۔

سابق میجر، محمد اسحٰق

ہم نشین دل

ہمارے ملک میں اور شاید دنیا کے دوسرے ملکوں میں بھی رواج ہے کہ موت کے بعد کسی کو برا نہیں کہتے۔ اس وقت مجھے اس رواج کی اچھائی برائی سے غرض نہیں ہے افسوس اس بات کا ہے کہ اس سے نیکوں کی نیکی پوری طرح اُجاگر نہیں ہو پاتی ایک انسانی ذہن کے لئے مشکل ہے کہ ایک ہی وقت میں درگذر اور نقد و نظر کے مختلف بلکہ مخالف عمل ملا سکے۔ اختر جب زندہ تھے تو ان کو بُرا سمجھنے والے شاذ و نادر ہی کہیں ہوں گے اور ان کے دوستوں سے دنیا بھری پڑی تھی۔ اب ان کی وفات کے بعد جب ان کا ذکر مقصود ہے تو دل میں یہ جھجک رہتی ہے کہ سننے والے اس میں مبالغہ آمیزی ڈھونڈیں گے۔

ان سے میرا پہلا تعارف غائبانہ تھا۔ یہ غالباً ۱۹۵۴ء کا ذکر ہے

ان کو سیکورٹی (سیفٹی؟) ایکٹ کے تحت نظر بند کر دیا گیا تھا۔ میں راولپنڈی سازش کیس میں قید تھا۔ تعارف صرف اتنا تھا کہ ان کی گرفتاری کی خبر اخبار میں دیکھی تھی باقی اندازہ تھا۔ اسیروں کو لامحالہ ایک دوسرے سے ہمدردی ہو جاتی ہے۔ یہ ہمدردی کسی حد تک جرم، خیالات اور نظریات کی نوعیت سے بالاتر ہوتی ہے۔ انسانی طبیعت کا خاصہ ہے کہ ایک بڑی مصیبت سر پر کھڑی ہو تو چھوٹی چھوٹی رنجشیں، مخالفتیں بلکہ معمولی دشمنیاں تک دب جاتی ہیں۔ سیاسی قیدیوں کا معاملہ تو اور بھی مختلف ہوتا ہے۔ انھوں نے کوئی جسمانی زیادتی نہیں کی ہوتی نہ اخلاقی حد بندیاں توڑی ہوتی ہیں۔ وہ سقراط کی طرح اپنے خیالات کی پاداش میں یا حضرت یوسف علیہ السلام کی طرح مصلحتِ شاہی کی خاطر قید کر دیے جاتے ہیں۔ اس لئے جیل کی دنیا میں، بدسلوکی کے باوجود ان کا ایک خاص دبدبہ اور وقار ہوتا ہے۔ اور قیدیوں اور جیل کی دوسری مخلوق میں ان کے لئے خواہ مخواہ کی ہمدردی اور عزت پیدا ہو جاتی ہے۔ اختر مرحوم اور میں چونکہ خیالات کی دنیا میں بھی ہم سفر تھے اس لئے ان سے ہمدردی کے علاوہ اُنس بھی پیدا ہو گیا تھا۔

پہلی ملاقات ۱۹۵۵ء میں ہوئی۔ ہم دونوں رہا ہو چکے تھے۔ میں طبیعت سے جیل کی گھٹن نکالنے کے لئے لاہور سے کراچی آیا تھا۔ ملتے

ہی دوستی ہو گئی۔ لیکن اس پر اصلی رنگ لاہور میں چڑھا جب وہ ٹائمز آف کراچی کے خاص نامہ نگار ہو کر آئے۔ میرا بجٹ ان دنوں کمزور تھا البتہ منہ کا مزہ بدلنے کے لئے اختر۔ ایرک، اور خطیب باری باری مجھے ہر ہفتے شہر کے پوش ریستورانوں میں لے جایا کرتے تھے دیر تک محفل جمتی تھی دنیا بھر کی باتیں ہوتی تھیں کوئی خاص سیاسی واقعہ ہوتا تھا تو بھی وہ اکثر بھاگے بھاگے آجاتے تھے یا میں ان کو ڈھونڈھ نکالتا تھا۔

ان کی طبیعت پر مجھے اتنا اعتماد تھا کہ ذہن کا ہر گوشہ ان کے آگے کھول کر رکھ دیتا تھا۔ ایک ایسا دوست جس کے ساتھ آدمی اس اعتماد سے بات کرے کہ گویا تنہائی میں خود سے مخاطب ہے۔ ایک بے بہا نعمت ہوتی ہے ان کی طرف سے کبھی بھی مجھے غیبت حسد یا رقابت کا شبہ نہیں ہوا اس کی ایک وجہ یہ تھی کہ ہمارے مشترک عقیدے کا پہلا اصول یہ ہے کہ انسان ذاتی، نسلی، قومی، خاندانی، مذہبی، اور ذہنی کدورتوں اور تعصبات سے آزاد ہو۔ اور ہر معاملے کو بے باک نظروں سے دیکھے اور ان کو سائنس کی کسوٹی پر پرکھے لیکن ہر آدمی بہت سے تعصبات لے کر پیدا ہوتا ہے اور بہت سے دوسرے اس کو ماحول کی طرف سے وراثت ہوتے ہیں۔ جن سے چھٹکارا پانا ایک دو دن کا کام نہیں

ہے۔ علاوہ ازیں پروگریسو لوگوں میں اختلاف رائے کا ہونا قدرتی امر بھی ہے۔ اس لئے کہ جہاں پیری مریدی کا سلسلہ نہ ہو۔ تنقید اور خود تنقید کا دور چلتا ہو۔ واقعات اور حالات کو ان کے اصلی روپ میں دیکھنے کی کوشش ہو۔ وہاں اعداد و شمار کی دستیابی، ان کی صحت اور ان کو خاص ڈھنگ سے پرکھ کر عمل کی راہ نکالنے میں اختلافات کا آجانا لابدی ہے۔ اور کام چونکہ جان جوکھوں کا ہوتا ہے اس لئے جذب و ایمان کے بغیر گاڑی آگے نہیں چلتی۔ اس طرح جذبات کی رو میں اکثر سر پھٹول رہتی ہے اور پسپائی کے دور میں اس کی شکایت عام ہوتی ہے ان حالات میں ایسے ساتھیوں کا مل جانا جن کے آگے آدمی اپنی ساری ذہنی کائنات کھول کر رکھ دے، بہت بڑی خوش نصیبی ہے اور اس سے طمانیت قلب کے علاوہ جو فیوض میسر ہوتے ہیں ان کا شمار نہیں۔

ستمبر اکتوبر ۱۹۵۸ء میں میرا کراچی آنا ہوا۔ تواتر سے اکثر ملاقات رہی۔ ان دنوں مولانا عبدالحمید خاں بھاشانی جنوب مشرقی ایشیا کے ملکوں کا دورہ کرنا چاہتے تھے اور مجھے بطور سیکرٹری ساتھ لے جانا چاہتے تھے۔ چنانچہ میں پاسپورٹ، ویزا اور دوسرے انتظامات کے سلسلے میں دارالحکومت پہنچا ہوا تھا اور اس سلسلے میں عوامی چین، انڈونیشیا، برما اور سیلون کے سفارت خانوں میں جانے کا اتفاق ہوتا تھا۔ کچھ دنوں کے

بعد ان کی دعوتوں میں بلایا جانے لگا۔ اختر بطور اخبار نویس ان کے مہمانوں کی فہرست میں تھے۔ چنانچہ وہی مجھے ان دعوتوں میں لے جایا کرتے تھے۔ ۸ر اکتوبر ۱۹۵۸ء کو سیاست سے رخصت پائی اور کراچی سے لوٹ آیا۔ اس وقت وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ اختر سے یہ آخری ملاقات ہوگی۔

۲۲ر یا ۲۳ر دسمبر ۱۹۵۸ء کو جب کہ میں بھاول پور جیل میں سیفٹی ایکٹ کے تحت نظر بند تھا، اخبار میں دیکھا کہ کراچی کے مشہور جرنلسٹ محمد اختر وفات پا گئے ہیں"۔ یقین نہ آیا۔ چھ فٹ سے نکلتا ہوا قد، تنومند جسم، زندگی کا مجسمہ، اس کو موت کیسے چھو سکتی تھی۔ خیال آیا (جس میں خواہش کو بہت کچھ دخل تھا) کہ چونکہ اخبار، اخبار نویسوں کے گھر کی غلام ہوتے ہیں اس لئے ضرور اختر کے کسی دوست نے مذاق کیا ہے۔ نہایت بھونڈا مذاق۔ بہرحال رات سخت تذبذب میں گذاری۔ دوسرے دن جب اخباروں میں مزید تفصیلات آئیں تو یقین آگیا۔ اور رُکا ہوا غم سیلاب کی صورت میں بہہ نکلا۔ اور میرے جذبات اور عقل و ہوش کی تباہی مچاتا ہوا نکل گیا۔ جیل کی صعوبتیں بچوں کا کھیل معلوم ہونے لگیں۔ ایک عزیز دوست مشکل وقت کا سہارا، خوشیوں کا ساتھی چلا گیا۔ زندگی کے تانے بانے میں بہت بڑا شگاف پڑ گیا۔ انہی دنوں ویسٹ انڈیز کی کرکٹ ٹیم ملک کا

دورہ کر رہی تھی۔ ایک دفعہ اختر پاکستان کی کرکٹ ٹیم کے ویسٹ انڈیز دورے میں بطور رپورٹر شامل ہوتے ہوتے رہ گئے تھے۔ پاسپورٹ نہیں ملا تھا، اب ان کی ٹیم جب بہاولپور میں میچ کھیلنے آئی تو میں نے دل ہی دل میں اختر کو ان کے ساتھ کر دیا۔ کھیل کا میدان جیل کی دیواروں سے زیادہ دور نہیں تھا۔ تماشائیوں کا شور مجھ تک پہنچ جایا کرتا تھا، چنانچہ جتنے دن میچ رہا اختر سے ملاقات ہوتی رہی۔ اب بھی کئی موقعوں پر تصور ہی تصور میں اختر کو موجود کر لیتا ہوں۔

اختر کی صحیح عظمت کا اندازہ مجھے اب جا کے ہوا۔ جب میں جیل سے رہائی کے بعد تعزیت کے لئے ان کے عزیزوں سے ملا ہوں۔ انگریزی کی ضرب المثل ہے کہ اپنے گھر میں کوئی شخص بھی ہیرو نہیں ہوتا۔ یہ اختر کی عظمت کا نشان ہے کہ ان کے گھر کے جس چھوٹے بڑے سے بھی ملا ہوں اس کو انھیں انسانیت نواز خیالات اور جذبات کا حامی پایا ہے جن سے اختر سرشار تھا۔ خاص کر نئی پود کو تو وہ اس طرح تربیت دے گیا ہے کہ اس کی یاد کا دیا مدت مدید تک روشن رہے گا۔

محمد مختار زمن

جواں تھا ابھی اختر

ہاں اے فلک پیر جواں تھا ابھی اختر
کیا تیرا بگڑتا جو نہ مرتا کوئی دن اور

یہ شاید ۱۹۴۱ء کا واقعہ ہے۔

میں اس زمانے میں الہ آباد یونیورسٹی کا طالب علم تھا۔ اس وقت پاکستان کی تحریک زور پکڑ رہی تھی۔ یونیورسٹی میں مسلمان لڑکے تھے تو اقلیت میں مگر یکجہتی اور اتفاق کچھ ایسا تھا کہ آج کل سوچو تو تعجب سا ہوتا ہے۔ مسلم اسٹوڈینس فیڈریشن کے جلسے اکثر ہوتے تھے اور ایک صاحب ڈھیلی دبیز سے کپڑے کی بھوری شیروانی پہنے اکثر نظر آتے تھے..... کسی نے میری ملاقات ان سے کرائی کہ یہ محمد اختر ہیں.... پھر اختر سے اچھی خاصی دوستی ہوگئی۔ اختر کا قد کافی لمبا تھا۔ اس وقت بھی جب کہ اس کی عمر کم تھی اپنے ہم عمروں

میں وہ سب سے بلند و بالا تھا۔ بعض آدمی قد کی لمبائی کے باعث عمر میں زیادہ معلوم ہوتے ہیں مگر اختر کا معاملہ دوسرا تھا۔ اس کے چہرے پر ایک بھولا پن ہمیشہ قائم رہا جس کا بڑا خوشگوار سا اثر اس کی شخصیت پر پڑتا تھا۔

اختر کا مکان الہ آباد کے محلہ پرانے کٹرے میں تھا۔ اور اس کے ماموں "لطیف میاں" وہاں کے معدودے چند کانگریسی مسلمانوں میں تھے اختر لطیف صاحب کی عزت تو کرتا تھا مگر سیاسی عقاید میں ان کا مخالف تھا۔ مجھے یاد پڑتا ہے کہ لطیف صاحب اسی زمانے میں میونسپلٹی کے الیکشن میں کھڑے ہوئے۔ باوجود رشتہ داری کے اختر ان کا مخالف ہی رہا۔ اس دوران میں اختر کی سیاسی دلچسپیاں بڑھ رہی تھیں۔ وہ طالب علموں کی جماعت کا ایک سرگرم کارکن تھا۔ اور پاکستان کی تحریک کا پرزور حامی بن چکا تھا۔ اب تو یہ سب خواب کی سی باتیں معلوم ہوتی ہیں مگر اس وقت میں بھی سیاسی تحریک میں کافی حصہ لیا کرتا تھا اور اسی لئے اختر کا ہمارے گھر آنا جانا اکثر رہتا تھا۔ شروع زمانہ میں نوجوان مسلمان جوش اور نعروں کے زیر اثر تھے اور قائد اعظم سے ہم سب مسحور ہو چکے تھے مگر پھر رفتہ رفتہ وہ زمانہ آیا جب ہم ذہنی طور پر آگے بڑھے اور یونیورسٹی کی تعلیم نے دماغ کے اندر کی بہت بند کھڑکیاں کھول دیں۔ اب کچھ لڑکے اقتصادی اور سیاسی اُمور کو ناقدانہ نگاہ سے دیکھتے تھے۔ پاکستان تو بنائیں گے مگر اسے کیونکر

چلائیں گے ؟۔ اس کے قانون کیسے ہونے چاہئیں ؟ اس کی اقتصادی حالت کیسی ہوگی ؟ —— یہ باتیں اس پرجوش دور میں بھی بعض فہمیدہ و سنجیدہ نوجوان سوچتے تھے۔ اختر سے ملاقات ہونے کے تین سال کے بعد مجھے یہ محسوس ہوا کہ اختر بھی ان لوگوں میں ہے جنہیں اللہ نے سوچنے کا مرض اور حساس طبیعت کا عارضہ دے دیا ہے، جسے یہ امراض لاحق ہوجائیں اس کی زندگی کچھ زیادہ آرام سے نہیں گزرتی۔ وہ سوچتا ہے اور کڑھتا ہے۔ اس کا مجھے یقین ہے کہ اختر کا دماغ اس زمانہ میں زندگی کے مسائل سوچنے میں لگا ہوا تھا۔ بہت سے نوجوانوں کی طرح وہ یہ تو محسوس کرتا تھا کہ نصب العین پاکستان ہے مگر پھر وہاں پہنچ کر کیا ہوگا ؟ وہ عوام کی طاقت کا قائل تھا افرسودہ جاگیرداریت سے نباہ اس کے بس کا نہ تھا۔ ملائیت کی طرف اس کی طبیعت راغب نہیں تھی۔ اندھی تقلید کے خلاف اس کا ذہن اُسے اُکساتا تھا۔ غرض کچھ اسی قسم کی ذہنی حالت تھی جبکہ میں اور وہ جُدا ہوگئے۔ میں ۱۹۴۷ء میں کلکتہ چلا گیا اور وہاں صحافت میں قسمت آزمائی شروع کردی۔ پھر ۱۹۵۴ء تک میری ملاقات اختر سے نہ ہوسکی۔ جب میں ۱۹۵۴ء میں کراچی آیا تو معلوم ہوا کہ اختر صاحب نہ صرف میرے ہم پیشہ ہیں بلکہ اسی شہر میں موجود ہیں۔ مل کر بڑی خوشی ہوئی —— سیاست کا پلیٹ فارم تو ہم دونوں کے پاؤں کے نیچے سے

کرکٹ کھسک چکا تھا۔ مگر صحافت کے میدان میں پھر ہمدوش رہے۔ اختر اپنی صحافتی زندگی کے پہلے دور میں "اسپورٹس کارسپانڈنٹ" تھا۔ طالبعلمی کے زمانے سے اُسے کرکٹ وغیرہ سے دلچسپی تھی۔ اس لئے غالباً اُس نے اسپورٹس اور کھیل کود کے کام لکھنا اختیار کر لیا اور حق یہ ہے اس لائن میں بھی مرحوم نے حق ادا کر دیا۔ یہ کہتے ہوئے مجھے شرم سی محسوس ہوتی ہے کہ میں اس کوچے سے محض نابلد ہوں اور اسپورٹس کے معاملے میں میری رائے ہی بیکار ہے مگر اس میدان کے پرانی کھلاڑی بھی کہتے ہیں کہ "اختر خوب لکھتا تھا"۔

مگر اس کی جولانی طبع کے لئے کھیل کا وسیع میدان بھی "تنگنائے غزل" کی حیثیت رکھتا تھا اور وہ کچھ دن کے بعد "جنرل رپورٹنگ" میں طبع آزمائی کرنے لگا۔ اخیر زمانہ میں وہ شام کے روزنامہ "لیڈر" میں چیف رپورٹر تھا۔ اس حیثیت سے جو کام اس نے کیا اس کی شہادت خود لیڈر کے اڈیٹر سلطان احمد نے دی ہے۔ حقیقت یہ ہے وہ سلطان کا دست راست ثابت ہوا۔ ہم لوگ اسے مذاق میں "ڈپٹی لیڈر" کہا کرتے تھے۔ شام کے اخبار میں کام کرنے والے کو چٹپٹی اور مزیدار خبریں ۱۲ بجے تک جمع کر کے لکھ لینی چاہئیں۔ روزانہ یہ کام کرنا آسان نہیں۔ مگر اختر کی خبریں اکثر جلی قلم سے چھپتی رہیں۔

لکھنے لکھانے کے علاوہ اختر صحافیوں کی انجمن میں بھی نمایاں حصہ لیتا

تھا اور پھر ہم سب نے مل کر اسے کراچی یونین آف جرنلسٹس کا جنرل سکریٹری چُن لیا۔ باوجود اپنی عدیم الفرصتی کے وہ اسی انجمن کے کام کے لئے بھی وقت نکال لیتا تھا اور نہایت کامیابی کے ساتھ وہ اس انجمن کو چلاتا رہا۔ اس کا مسکراتا ہوا چہرہ ہمیشہ انجمن کی مجلسوں میں نظر آتا تھا وہ ایماندار آدمی تھا اس لئے اخیر زمانے میں کہا کرتا تھا کہ مجھے اپنے کاموں سے اتنی فرصت نہیں ملتی کہ انجمن کا کام خاطر خواہ کر سکوں۔ مگر اس کے باوجود اس نے بہت کچھ کیا اور انجمن ہمیشہ اس کی مرہون منت رہے گی۔

موت کے سخت و سرد ہاتھوں نے جب اسے ہم سے چھینا ہے اس وقت وہ زندگی سے بھرپور تھا۔ انجمن کی سیاست اور صحافت دونوں میں چمک رہا تھا اور ہمیں اس سے بڑی اُمیدیں وابستہ تھیں۔ اختر دُبلا پتلا آدمی تھا۔ سُنا تھا کہ اس کا دل بھی کمزور ہے مگر کسی کو سان گمان بھی نہیں تھا کہ وہ یوں چل دے گا۔ یکایک پتہ چلا کہ بیمار ہو کر اسپتال میں داخل ہو گیا۔ اور بس گھنٹوں اور منٹوں میں حالت بد سے بدتر ہوتی چلی گئی۔ اور ایک دن ماں باپ، بھائی بہن۔ یار دوست سب دیکھتے رہ گئے۔ اور وہ سب کچھ روتا ہوا چھوڑ کر چل دیا۔ لوگوں کو یقین نہیں آتا تھا کہ اب وہ ہم میں نہیں ہے۔ اور واقعی وہ ابھی تک ہم میں ہے اس کی تصویر صرف کراچی کلب کے لاؤنج ہی میں نہیں، اس کے جاننے والوں اور اُسے پیار کرنیوالوں کے دلوں میں بھی آویزاں ہے اور آویزاں رہے گی۔

طفیل احمد جمالی

اختر ایک خاموش طوفان!

ہم لوگ پریس کلب میں بیٹھے خوش گپیاں کر رہے تھے، اور اختر عقبی برآمدے میں ٹیبل ٹینس کھیل رہے تھے، کلب کے تمام کھیلوں میں انھیں صرف ٹیبل ٹینس سے ہی دلچسپی تھی، اور اس میں انھیں خاصی مہارت بھی حاصل تھی، کیونکہ وہ اپنی طالبعلمانہ زندگی میں اسپورٹس کے کافی دلدادہ رہ چکے تھے، البتہ بعد میں انھوں نے کھیلوں سے اپنا شغف عملی طور پر قائم رکھنے کے بجائے صرف تحریر تک محدود کر دیا تھا، اور وہ دراصل صحافتی دنیا میں پہلے پہل اسپورٹس رپورٹر کے طور پر ہی داخل ہوئے تھے، لیکن ان کے کھیلوں سے عملی دلچسپی ختم کر دینے کا سبب وہ نہیں تھا جو عام طور پر ہوتا ہے، عموماً تو لوگ کسب معاش اور اہل و

عیال کے ہنگاموں میں پڑ کر تفریحی مشاغل کو بھول جاتے ہیں۔ خصوصاً دماغی کام کرنے والے طبقہ کے افراد تو صرف قلم دوات کو ہی اوڑھنا بچھونا بنا لیتے ہیں۔ لیکن ان لوگوں میں سے نہیں تھے۔ ان کا بس چلتا تو وہ صحافت کا پیشہ اختیار کرنے کے بعد بھی کسی کرکٹ ٹیم میں شریک ہو کر روزانہ نہ کسی ٹیم سے میچ کھیلا کرتے، لیکن انھیں ایک مجبوری لاحق ہو گئی تھی۔ انھیں یونیورسٹی کے زمانے میں ہی نہ جانے کیسے قلب کا عارضہ لاحق ہو چکا تھا، اسی لئے ڈاکٹروں نے انھیں زیادہ جسمانی ورزش، کھیل کود، بلکہ زیادہ چلنے پھرنے سے منع کر دیا تھا، مگر اوّل تو وہ رپورٹر تھے جس کا کام ہی چلنا پھرنا ہوتا ہے، دوسرے وہ یک لخت اپنے تمام تفریحی مشاغل کیسے ختم کر سکتے تھے۔ لہٰذا انھوں نے کرکٹ ہاکی وغیرہ کو تو خیرباد کہہ دیا لیکن ٹیبل ٹینس جیسے ہلکے پھلکے کھیل کو اکثر جائز کر لیا کرتے تھے،

اور یہی بات انھوں نے مجھ سے اس دن بھی کہی جس کا میں ذکر کر رہا ہوں، جب اختر کافی دیر تک ٹیبل ٹینس کھیلنے کے بعد کمرے میں آئے تو میں نے ان سے کہا "بھئی اختر تمہیں تو ڈاکٹر نے کھیل کود اور جسمانی ورزش سے منع کر رکھا ہے، پھر تم اتنی دیر سے ٹیبل ٹینس کیسے کھیل رہے تھے"؟ اختر نے جواب دیا، ہاں منع تو کر رکھا ہے، لیکن میرا

خیال ہے ٹیبل ٹینس میں زیادہ تکان نہیں ہوتی، پھر میں کوشش بھی یہی کرتا ہوں کہ اپنی جگہ سے زیادہ ہلے جلے بغیر ہی کام چلا لیا کروں" یہاں پہنچ کر وہ خود بھی مسکرائے اور مجھے بھی ہنسی آگئی کیونکہ اختر کے قد کی لمبائی ان کے دوستوں کے حلقے میں دل لگی کا عام موضوع تھی، اور ان کے لئے واقعی یہ مشکل کام نہیں تھا کہ وہ ٹیبل کے ایک سرے پر کھڑے ہو کر اپنے لمبے لمبے ہاتھوں کی مدد سے اتنا ہی اچھا کھیل سکیں جتنا ان کا مدمقابل گیند کے پیچھے چاروں طرف ناچ ناچ کر کھیل سکتا ہو، یہی سوچ کر ہم دونوں ہنس پڑے، مگر جلد ہی میں ذرا پھر سنجیدہ ہو گیا، میں نے کہا کچھ بھی ہو دل پر بار تو پڑتا ہی ہے ٹیبل ٹینس کھیلنے سے اس پر اختر نے یہ صفائی پیش کی کہ میں اس کا ہمیشہ خیال رکھتا ہوں اور عموماً دو ایک سیٹ سے زیادہ نہیں کھیلتا، البتہ آج کچھ زیادہ کھیل گیا ہوں۔

اور اس کے بعد ہم لوگ ادھر اُدھر کی باتیں کرنے لگتے درمیان میں ان کی لمبائی پر کبھی کبھار چوٹیں بھی ہو جاتی تھیں، اور اختر دوسروں کے ساتھ خود بھی ان چوٹوں سے لطف اندوز ہوا کرتے تھے۔

مجھے اچھی طرح یاد ہے، ایک دفعہ کوئی رات کو بارہ ساڑھے بارہ بجے میں چند دوستوں کے ساتھ فریئر روڈ پر سے گزر رہا تھا کہ اتنے میں سامنے سے اختر آتے نظر آئے انھوں نے بھی مجھے دیکھا، بولے بھئی تم اس

وقت یہاں کہاں؟" میں نے کہا میں تو اکثر اس وقت کیفے فردوس سے اُٹھ کر گھر جاتے ہوئے ادھر سے گزرتا ہوں، لیکن تم کبھی نظر نہیں آئے، اختر بولے، میں بھی اپنے دفتر (ٹائمز آف کراچی) سے عموماً اسی وقت فارغ ہو کر نکلتا ہوں، لیکن تم کبھی دکھائی نہیں دیتے، اس پر مجھے فوراً ایک پھبتی سوجھ گئی میں نے کہا ہاں بھئی قصور دراصل میرا ہی ہے، مجھے خود سمجھ لینا چاہیئے تھا کہ اختر کو اتنے نیچے کی چیز نظر نہیں آتی، آئندہ سے میں کسی درخت پر چڑھ کر بیٹھا کروں گا،

اسی قسم کے لطیفے اس وقت بھی ہوتے رہتے اور کلب ہمارے بے فکر قہقہوں سے گونجتا رہتا، لیکن اس وقت ہم میں سے کسی کو یہ گمان بھی نہ تھا کہ آج سے صرف دو مہینے بعد یہی کمرہ خود ہماری المناک چیخوں سے گونجے گا، اور اس میں اختر کی آواز شامل نہیں ہوگی، کیونکہ وہ ہم سے جدا ہو کر ابدی نیند سو چکا ہوگا، اور آج جس کرسی پر اختر بیٹھا ہے، اس پر وہ آئندہ پھر کبھی نہیں بیٹھے گا، بلکہ اس سے چند منٹ کے فاصلے پر اس کی مسکراتی ہوئی تصویر آویزاں ہوگی، اختر کے غمزدہ دوستوں کی ویران محفلوں کو اس فانی محفل کی یاد دلانے کے لئے جس کی جبلی شرافت، معصوم طبیعت، شگفتہ مسکراہٹ اور انسانی ہمدردی سے بھرپور دل کو وہ کبھی نہیں بھول سکیں گے!

آج بھی میں اکثر اس وقت جب پریس کلب کے اس کمرے میں جہاں اختر کی تصویر آویزاں ہے، کوئی نہیں ہوتا، اختر کی تصویر سے مخاطب ہو کر شکوہ کرتا ہوں اختر تم نے میری بات کیوں نہیں مانی، تم ڈاکٹر کے منع کرنے کے باوجود ٹیبل ٹینس کیوں کھیلتے رہے، تم نے اپنے دوستوں کو اپنے ذرا سے شوق کی خاطر اپنی پیاری پیاری سی دلنواز مسکراہٹوں سے کیوں محروم کر دیا، تم نے کراچی یونین آف جرنلسٹس کا خیال بھی نہیں کیا، جس کے تم جنرل سکرٹری تھے اور جو تمہارے بعد اپنے ایک انتہائی پرجوش خادم سے ہمیشہ کے لئے محروم ہو گئی۔!

اختر نہایت خاموشی سے میرے گلے سنتا ہے، اور بدستور مسکراتا رہتا ہے، شاید آج وہ جس جگہ پر ہے وہاں پہنچ کر یہ زندگی بڑی بے حقیقت معلوم ہوتی ہے، اس لئے اس کی سمجھ میں نہیں آتا کہ میں کیا کہہ رہا ہوں، لیکن میں اسے غلط دوش نہیں دیتا، واقعی اختر نے میری نصیحت ان سنی کر کے مجھ پر، اپنے تمام دوستوں پر، اپنے بے انتہا محبت کرنے والے باپ، اپنی موت پر پاگل ہو جانے والی ماں اپنی جان چھڑکنے والی بہنوں، اور اپنے پیارے بھائی سرور پر بڑا ظلم کیا ہے، اگر وہ میری نصیحت پر عمل کرتا تو وہ دن کیوں طلوع ہوتا جب پچھلے سال کوئٹہ کی ہوا پہلی مرتبہ چلی تھی، اور وہ پریس کلب میں کافی دیر تک ٹیبل

ٹینس کھیل کر پسینہ خشک کئے بغیر باہر نکل گیا تھا، اور گھر پہنچتے پہنچتے بخار سے کانپنے لگا تھا، اس بخار سے جو آناً فاناً میں ڈبل نمونیہ بن گیا، اور اس میں اس کے مجروح دل نے اور بھی پیچیدگی پیدا کر دی تھی ایسی پیچیدگی جو تین دن تک کراچی کے بہترین ڈاکٹروں کی سمجھ میں ہی نہیں آئی، اور اختران تمام کٹھن اور صبر آزما راتوں اور دنوں میں درد سے کراہتا اور موٹے موٹے تکئے لگائے بیٹھا رہا کیونکہ اس کے دل کی تکلیف اسے بیٹھنے کی اجازت نہیں دیتی تھی، اور آخر کار اسے اس ناقابل برداشت اذیت سے نجات دلانے کے لئے فرشتہ اجل کو آنا پڑا، جو اسے تو اس عذاب سے چھڑا لے گیا مگر اس سے محبت کرنے والے ہزاروں دلوں کو ہمیشہ کے لئے تڑپا گیا!

موت جب حقیقت بن جاتی ہے اور ایک پیارا عزیز یا دوست عین عالم جوانی میں ہم سے جدا ہو جاتا ہے تو ہم جب تک رو سکتے ہیں روتے ہیں لیکن اس کے بعد آنسوؤں کے خزانے خالی ہو جاتے ہیں لیکن دل اس کے غم سے معمور رہتا ہے، البتہ وہ غم رفتہ رفتہ آہوں اور فریادوں کی منزلوں سے گزرتا ہوا فلسفہ بن جاتا ہے، درد و غم کے مارے ہوئے دل فلسفہ کی آڑ میں پناہ ڈھونڈھنے لگتے ہیں، ہم سوچتے ہیں موت زندگی کی طرح ایک ابدی حقیقت ہے، زندگی اگر ایک چھوٹی سی گوشت

پوست کی دنیا کا آغاز ہے تو آخر اس کا کوئی انجام بھی ہونا چاہیئے، اور موت اسی انجام کا دوسرا نام ہے، اور کون جانے یہ انجام پھر کسی نئے سفر کا آغاز نہ ہو۔

اور آج شاید اختر کے تمام سوگوار دوست اور عزیز اپنے زخموں پر ایسے ہی کسی فلسفہ کا مرہم اپنے دل کے زخموں کو اپنی ہی نگاہوں سے چھپانے کی کوشش کر رہے ہوں، لیکن فلسفہ زیادہ سے زیادہ دماغ کا مرہم ہو سکتا ہے، دل کا گھاؤ اس سے کبھی نہیں بھر سکتا، اختر مجھے اس لئے اور بھی عزیز تھا کہ وہ ہمارے ملک کے بیشمار نوجوانوں کی طرح صرف اپنی ذاتی خوشیوں اور اپنے دکھوں کے لئے زندہ نہیں تھا، بلکہ قدرت نے اسے غم کائنات عطا کیا تھا، اس کے سینہ میں ایک قلب بیدار تھا، جو یوں تو بہت کمزور تھا مگر اس پر ہزاروں صحت مند اور توانا دل قربان کئے جا سکتے تھے، کیونکہ اس میں انسانیت کا درد موجزن تھا۔

اختر نے اور میں نے اور میری طرح ہماری نسل کے بیشتر افراد نے عملی طور پر میدان سیاست میں کوئی چونکا دینے والا کارنامہ انجام نہیں دیا، لیکن ہم نے اپنی بساط بھر اپنے آدرش کو زندہ رکھنے کی کوشش ضرور کی ہے، ہم اس دنیا، اس ملک کے اندھیروں میں کوئی

الاؤ نہ دہکا سکے ہوں لیکن ہم نے اپنے دلوں کے ایوانوں کو اپنے نظریات کی شمع سے ہمیشہ روشن رکھا ہے،

اختر خود کو انسانیت کے اس بحرِ بیکراں کا ایک قطرہ سمجھتا تھا، کسی سنیاسی کی آنکھ سے ہمالیہ کی چوٹیوں پر ٹپکا ہوا تنہا آنسو نہیں سمجھتا تھا، جو بہہ جائے تو بے معنی اور رہ جائے تو بے سود، وہ جانتا تھا کہ میں ایک قطرۂ ناچیز سہی لیکن زندگی کا سمندر بہت بڑا ہے، اگر یہ خشک ہو گیا تو آسمان بادلوں کے لئے اور کھیتیاں پانی کے لئے ترس جائیں گی، اس لئے میں کسی صورت تنہائیوں میں گوہر شاہوار بن کر نہیں بیٹھ سکتا، میرا کام طوفانوں کی پرورش کرنا ہے، وہ طوفان جن سے زندگی کا بحرِ خار زندہ اور متحرک رہتا ہے۔

سید بادشاہ حسین

دوست اور ساتھی

اختر کو مرحوم لکھتے ہوئے کچھ تکلف سا ہوتا ہے۔ تکلف اس لئے نہیں ہوتا کہ موت کوئی عجیب چیز ہے کیونکہ بقول شخصے "زندگی موت سے زیادہ تعجب خیز ہے"۔ زیادہ چیزیں اسی دنیا میں ایسی ہیں جو انسانی زندگی کے درپے آزار ہیں۔ زندگی میں رکاوٹیں ڈالنے والی اور موت کو قریب تر کرنے والی طاقتیں ہر ہر قدم پر برسرپیکار رہتی ہیں۔ انسان ان کا مقابلہ کس طرح کرتا ہے اور اپنے آپ کو کس طرح ان سے بچائے رکھتا ہے بجائے خود ایک کرشمہ ہے۔

ہاں تو اختر کو مرحوم کہتے ہوئے تکلف یوں ہوتا ہے کہ انسان نے طبعی عمر کا ایک تصور اپنے ذہن ناقص میں کر رکھا ہے اور ضعیفی سے پہلے موت کو بے وقت سمجھتا ہے۔ اسی جذبہ اور تصور کے تحت اختر کی جوانا مرگی تعجب کا باعث ہوتی ہے اور اس کو مرحوم لکھتے وقت ان تقاضوں کے تحت تکلف سا

ہوتا ہے بہرحال اختر کو مرحوم لکھا جائے یا نہ لکھا جائے فرق نہیں پڑتا۔ وہ تو اللہ کو پیارا ہوا ہے موت سے کس کو رستگاری ہے

آج وہ کل ہماری باری ہے

انسان جذبات کا پتلا ہے۔ کراچی پریس کلب میں ٹنگی ہوئی اختر کی تصویر پر جب بھی نظر پڑتی ہے تو خیال گزرتا ہے کہ وہ کلب کو پابندی سے آنے والا آج کیوں غیر حاضر ہے؟ سرور (اختر کے بھائی ڈاکٹر سرور) کبھی کبھار برج کے ضوق میں کلب آجاتے ہیں تو بے اختیار دل چاہتا ہے کہ پوچھیں "اختر کہاں ہے؟"

اختر سے میری ملاقات کی ابتدا ٹائمز آف کراچی سے ہوئی۔ شروع شروع ہم ایک دوسرے کو جاننے پر ہی اکتفا کرتے تھے۔ پھر سلام علیک کا سلسلہ شروع ہوا۔ اور ایک دن یہ رسمی تکلف بھی ٹوٹا..... میرے ساتھ اکثر یہ ہوتا رہا ہے اور اب بھی ہوتا ہے کہ جہاں دو ایک دوست اکٹھے ہوئے اور کوئی سنجیدہ موضوع تبادلہ خیال کے لئے نہ رہا بس ہاتھ کی لکیروں اور پیشینگوئیوں سے متعلق بات چیت شروع ہوگئی۔ اسی پر اکتفا نہیں کیا جاتا بلکہ کوئی نہ کوئی اپنا ہاتھ بڑھا دیتا ہے میرے لئے ایک مشغلہ اور خود اپنے لئے دلچسپی کا سامان مہیا کر دیتا ہے۔ چنانچہ اس دن بھی یہی ہوا۔ ایک ساتھی اپنے ہاتھ کی لکیریں مجھ سے پڑھوا رہے تھے اور اختر اشتیاق بھری نظروں

سے دیکھ رہے تھے۔ ان سے فراغت ہوئی تو کہنے لگے۔

"ہو جائے ایک نظر میرے ہاتھ کی لکیروں پر بھی؟"

جوں ہی میری پہلی نظر ان کے دل کی لکیر پر پڑی مجھ سے شاید بے اختیار تعجب کا اظہار ہوا

"کیوں کیا بات ہے؟" مسکرا کر کہنے لگے

"نہیں۔ کوئی خاص بات نہیں" میں نے ٹال دیا

"کچھ تو بات ہے ـــــ صاف صاف بتائیے؟"

"میں چاہتا تھا کہ ذرا پرنٹ لے لوں پھر تفصیل سے بات ہوگی۔ اس وقت پرنٹ لینے کا سامان ساتھ نہیں، کل لیتا آؤں گا"

دوسرے دن انھوں نے یاد دہانی کی اور میں نے دوپہر کے بعد پرنٹ لے لیا۔ دو چار باتیں ملازمتوں کی تبدیلی سے متعلق میں نے بتائیں، رجحانات کے بارے میں کچھ باتیں ہوئیں پھر مستقبل کا ذکر آیا لیکن وہ اس سے مطمئن نہ ہوئے۔

"مگر وہ بات تو بتائیے جس نے کل آپ کو متعجب کیا تھا؟" انھوں نے اصرار کیا۔

تھوڑی دیر میں سوچتا رہا کیونکہ ان کے دل کی کمزوری الجھن کا باعث ہو رہی تھی۔ میری سمجھ میں نہ آتا تھا کہ اس کا ذکر کیا جائے تو کس طرح؟

بالآخر جب مجھے اندازہ ہو گیا کہ انھوں نے بھی کچھ بھانپ لیا ہے تو میں نے رُکتے رُکتے پوچھا

"آپ کو دل کا عارضہ تو خدانخواستہ نہیں ہے؟"

"اچھا تو یہ بات تھی۔ آپ تکلف کیوں کر رہے تھے — ہے تو سہی"

"دو سال پہلے اس ضمن میں آپ کو خاصی تکلیف رہی ہو گی؟"

"ہاں سخت دورہ پڑا تھا۔ یوں سمجھئے کہ بس بچ گیا" انھوں نے اقرار کیا اور سلسلہ جاری رکھا۔

"ڈاکٹروں نے ہمیشہ احتیاط کرنے کے کہا۔ ان کے کہنے سے ہر قسم کی ورزش اور کھیل کود سے دور رہتا ہوں..... آپ کو بھی کسی سخت قسم کا خطرہ نظر آتا ہے؟"

ڈاکٹروں کے مشوروں پر عمل کرنا چاہیئے اور باقی اندیشوں سے بے نیاز ہونا ہی بہتر ہے"

ٹائمز آف کراچی میں اختر اسپورٹس کے نام نگار تھے۔ مجھے بھی کھیلوں سے دلچسپی رہی ہے بلکہ کبھی میں نے اس قسم کا کام بھی کیا ہے اس لئے اس موضوع پر اکثر گفتگو رہا کرتی اور جلد ہی ہم بے تکلف بھی ہو گئے۔ کرکٹ میچ خصوصاً ٹسٹ ہم نے اکثر ساتھ ہی دیکھے ہیں۔ نیشنل اسٹیڈیم پہنچتے اور لنچ کی تکلیفوں کو ہم بانٹ لیا کرتے تھے۔ ہمارے ہاں اسپورٹس میں بھی کبھی

کبھی سیاست کو دخل ہو جاتا تھا اور ان کے کرتا دھرتا سیاسی جوڑ توڑ سے کام لیا کرتے۔ یہ بات مجھے سخت ناپسند تھی اور اختر بھی اس سے بے زار نظر آتے تھے۔ چونکہ ان کو اندرونی حالات کا پتہ زیادہ رہتا تھا اس لئے اپنے کالم میں اکثر و بیشتر دو ٹوک کہنے سے باز نہیں آتے تھے۔ میرے علم میں دو ایک مواقع ایسے ہیں جبکہ بعض افراد نے اس سلسلہ میں ان کی بے باکی کی شکایت کی مگر وہ اس کی پروا نہ کرتے تھے اور صاف بیانی سے دریغ نہ کرتے۔ ایک اور خوبی ان میں یہ تھی کہ کسی پارٹی یا شخصیت کے ڈھنڈورچی کبھی نہ بن سکے۔ جو سمجھ میں آیا اور جو سوجھا لکھ دیا۔ اس کا خیال نہ کیا کہ کس کی تعریف کر رہے ہیں اور کس کی مذمت۔

پاکستانی ایمپائر کے فیصلوں کے بارے میں عجیب طرح سے غلط فہمیاں شروع ہوئیں۔ باہر کے ٹیموں نے ہارنے کے بعد میٹنگ اور ٹرف کے فرق کو ضرورت سے زیادہ اہمیت دی۔ ہندوستانی ٹیم یہ راگ نہیں الاپ سکتی تھی تو اس نے ایمپائر کے فیصلوں کو جانبدارانہ قرار دیا۔ ایک دفعہ میں ہندوستانی کھلاڑیوں سے رسمی گفتگو کر رہا تھا۔ ایک صاحب نے پوچھا!

"ٹائمز آف کراچی میں کرکٹ کا حال آپ لکھ رہے ہیں"

"نہیں، اختر لکھتے ہیں" میں یہ کہنے ہی پایا تھا کہ اختر بھی آ گئے

اور میں نے رسماً تعارف کر دیا۔ اختر نے دو ایک متعلقہ باتیں پوچھیں جس کا جواب محض ضابطہ کی تکمیل کی حد تک دیا گیا مگر بات گھوم پھر کر ایمپائر کے فیصلوں کے بارے میں آئی۔ اختر نے ایک ذمہ دار شخصیت سے پوچھا

"آپ نے اس بارے میں کوئی تحریری احتجاج کیا ہے؟"

"میں کہنا نہیں چاہتا کیونکہ اس کی اشاعت اس مرحلہ پر نامناسب ہے" انھوں نے جواب دیا

"اس لئے کہ 'عذر شکست بدتر از شکست'" میں نے دخل دیا

ریس کی رپورٹنگ بھی ان کے ذمہ تھی لیکن مجھے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس میں انہیں کوئی خاص دلچسپی نہیں۔ جہاں تک میں جانتا ہوں وہ ریس کورس تو جاتے تھے لیکن وہاں شرط نہیں لگاتے تھے۔ مجھے ان کے ساتھ ریس کورس جانے کا کبھی اتفاق نہیں ہوا۔ کبھی کبھار ریس کی پالیٹکس پر بھی وہ لکھ جاتے تھے اور اندرونی حالات کے بارے میں اشارے کنائے کر دیتے تھے۔ ایک دفعہ ٹائمز آف کراچی ہی کے زمانے میں اس بارے میں کوئی جھگڑا کھڑا ہوا تھا مگر وہ اپنے آپ رفع دفع ہو گیا۔

ٹائمز آف کراچی کے بعد ان کا اور میرا ساتھ لیڈر میں رہا۔ ایک ساتھی کی حیثیت وہ بہت ہی خوشگوار شخصیت کے مالک تھے لیڈر میں ان کے ذمہ ہر قسم کا کام تھا۔ سیاسی رپورٹنگ۔ اسپورٹس کی خبریں۔ کالم

اور پروفائیل بھی لکھنا ہوتا تھا اور جب سلطان صاحب انگلینڈ گئے تو وہ اداریہ بھی لکھا کرتے تھے۔ میں نے دیکھا کہ وہ کام کو پھیلاتے نہیں بلکہ سمیٹتے تھے۔ جو کچھ انھیں کرنا ہوگا اولیں فرصت میں جلد سے جلد اس کو نبٹ لیں گے اور پھر اس سے فراغت پاکر ادھر ادھر کی گپ شپ اور تفریح کی طرف متوجہ ہوں گے لیکن جب تک کام ختم نہ کرلیں بے ضرورت چیزوں میں اُلجھتے نہ تھے اور نہ کبھی ٹال مٹول کرتے تھے۔ عادتاً وہ کسی کے ٹوکنے یا فرائض کی طرف متوجہ کرانے سے بیزار اور ناخوش ہوتے تھے مگر یہ اظہار ناخوشی بھی نہایت عارضی اور وقتی ہوتا تھا۔ کبھی ہنس کے ٹال دیتے اور کبھی دوٹوک جواب بھی دیدیتے لیکن دل میں میل نہیں رکھتے تھے۔

طبیعت میں سنجیدگی کے ساتھ ساتھ صاف دلی بھی تھی۔ بلاضرورت بال کی کھال نہیں نکالتے تھے اور نہ غیر متعلق تفصیلات میں جاتے تھے بالادستوں کی خوشامد یا مصاحبت ان کو بالکل پسند نہ تھی۔ کبھی بن بلائے ان کے ہاں جانے اور درباداری کے روادار نہ ہوتے تھے بلکہ اس طریقہ کار پر عمل کرنے والے ساتھیوں کا مذاق اُڑاتے اور ان پر طنز کرتے تھے۔

پروفائیل تو وہ اکثر لکھا ہی کرتے تھے لیکن سردار عبدالرب صاحب نشتر کے انتقال پر ان کے خاندان کا انٹرویو بہت اچھے انداز میں لکھا تھا

یا پھر چودھری خلیق الزماں کا پروفائیل اپنے خاص انداز میں تحریر کیا تھا۔ یوپی کی سیاست اور چودھری صاحب کے حالات سے وہ واقف ہی تھے۔ اس لئے بعض سوالات انھوں نے کافی مزیدار کئے اور ان کو لکھا بھی خوب تھا۔

کراچی پریس کلب کے قیام میں اختر نے بڑی دلچسپی لی تھی اور کراچی یونین آف جرنلسٹ کا کام وہ بڑی توجہ سے کرتے تھے۔ لیڈر چھپنے کے لئے مشین پر گیا کہ وہ کھانے کی تیاری کرتے تھے۔ کھانا کھا یا اپنا کالم یا پروفائیل لکھا اور چار بجتے بجتے وہ کلب جانے کے لئے آمادہ ہوتے، شروع شروع میں تو وہ بلاناغہ اپنے ساتھیوں کو بھی کلب چلنے کے لئے کہا کرتے بلکہ ایک آدھ کو ضرور اپنے ساتھ لے لیتے۔ کلب میں کبھی کبھار ٹیبل ٹینس یا شطرنج کھیل لیا اور بس، باقی وقت چائے پینے یا پلانے یا پھر گپ شپ میں صرف کرتے تھے جہاں تک مجھے یاد ہے تاش نہ کھیلتے تھے۔ اتوار کو اپنے ساتھ سرور صاحب کو لے آتے۔

انتقال سے چند دن پہلے کا واقعہ ہے کہ وہ مجھے ہاتھ دکھانے پر مُصر ہوئے۔ میں نے پوچھا۔

"کیا بات ہے؟ کوئی منصوبہ تیار کر رہے ہو؟"

"نہیں کوئی خاص بات نہیں" مسکرا کر کہنے لگے

"یہ تو سب ہوتا رہے گا۔ میرے خیال میں شادی کر ڈالو"

یہ تو آپ ہی بتائیں گے کہ کب شادی ہو گی؟"

ہم لوگ کبھی کبھی انہیں چھیڑا کرتے تھے کہ تمہاری بابت ایک صاحب تفصیلات دریافت کرتے تھے۔ کچھ کھلاؤ پلاؤ تو تمہاری مناسب طریقے پر توصیف کر دیں تاکہ شادی کی بات چیت پکی ہو جائے۔

اس روز وہ بڑی سنجیدگی کے ساتھ کہنے لگے۔

"آپ کو تو معلوم ہی ہے کہ میرا دل کتنا کمزور ہے۔ (x ——— x ——— x)۔ ——— ان حالات میں کبھی سنجیدگی کے ساتھ سوچتا ہوں کہ شادی کرنا مناسب بھی ہے یا نہیں؟"

چند ہی روز بعد معلوم ہوا کہ ان کا تردد اس بارے میں کتنا صحیح تھا۔

حمید اختر

تاریک شہر

میرے دوست! تم تقاضا کر رہے ہو کہ اختر مرحوم کے بارے میں کچھ لکھ کر بھیجوں اور میں برابر بہانے گھڑ رہا ہوں اس لئے نہیں کہ مرحوم کے متعلق کچھ لکھنے کو میرے پاس نہیں ہے بلکہ اس لئے کہ اس جوانا مرگ ہنس مکھ خوش خصال دوست کی یادیں اتنی زیادہ ہیں کہ انہیں سمیٹنے کی مجھ میں سکت ہی نہیں ہے، تم خود گواہ ہو کہ ہر برس لاہور سے کراچی کا سفر مجھ پر فرض تھا، چند سال پہلے ایک پیارا دوست اسی شہر میں چھت سے چھلانگ لگا کر مر گیا تو مجھے کراچی کے خیال ہی سے وحشت ہونے لگے اور پچھلے تین برس سے میں نے کراچی کا رُخ نہیں کیا، گزشتہ سال اختر مرحوم داغ مفارقت دے گیا، اب تو شاید میں کبھی کراچی کا خیال بھی دل میں نہیں لاسکوں گا، تمہارا شہر اب اندھا شہر ہے

اس کے گلی کوچے سُونے ہیں، اس کے بانکوں کو تم لوگوں نے کندھا دیا۔ اور ہزاروں من مٹی کے نیچے دفن کر آئے، مجھے حیرت ہے مدت کے بعد سراسر بے سیائی کی زندگی بسر کر رہا ہوں مگر تم لوگ جو شعر کہتے ہو اور خوشبوؤں کی باتیں کرتے ہو کیوں کر زندگی گزار رہے ہو؟

یہ حقیقت بڑی دردناک ہے کہ موت کا حملہ سب سے پہلے انہی لوگوں پر ہوتا ہے جو بظاہر موت کی ضد نظر آتے ہیں۔ کبھی کبھی جب میں مرحوم اختر کے بارے میں سوچتا ہوں تو یہ محسوس ہوتا ہے کہ شاید اس نے اور اس کے دوستوں نے اس کی بیماری کو سنجیدگی سے نہیں لیا، ممکن ہے اس کا علاج صحیح نہ ہوا ہو، شاید وہ بچ جاتا ورنہ یہ کیسے ممکن ہے کہ ایک جوان زندگی سے بھرپور اور صحت مند آدمی اس طرح دیکھتے دیکھتے موت کا شکار ہو جائے، ظالمو تم نے اسے کیوں مرنے دیا؟ ابھی تو اسے پوری زندگی گزارنی تھی، یہ تیس سال جو اس نے زندگی کے نام پر بسر کئے، سب کے سب آزمائش میں گزر گئے، اس جد و جہد میں تو اس نے ناکردہ گناہوں کی سزا پائی، کاش اس مرحوم کو زندگی کے کچھ لمحے اطمینان سے گزارنے کا موقعہ بھی مل جاتا، اپنی زندگی اور اپنی آسائشوں کے بارے میں اس نے کبھی سوچا تک نہیں تھا، کارکن صحافیوں کے حالات سدھارنے، اخبار نویسوں کی انجمن چلانے اور

ملک میں کھیلوں کو ترقی دینے کے منصوبے بنانے میں اس نے یہ کبھی نہ سوچا کہ زندگی بڑی حسین بڑی خوبصورت اور دلکش چیز ہے اور اس کے بہتر پہلو کا کچھ حصہ تو اس کی ذاتی ضرورتوں میں بھی آنا چاہیئے، اس کے برعکس اس نے جو کچھ بھی اس کے پاس تھا زندگی کے نام پر بانٹ دیا۔

گزشتہ سال اس ناگہانی موت سے چند ہی ماہ قبل وہ لاہور سے کراچی واپس گیا۔ لاہور کے تین چار مہینے کے قیام کے دوران میں اس سے روزانہ ملاقات ہوتی رہی، میں نے اسے کبھی ملول نہیں دیکھا۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ کراچی سے آنے پر پہلی دفعہ مجھ سے ملا تھا، میں اسے اپنے گھر لے گیا، چائے پیتے وقت میں نے کہا "اختر تم شادی کیوں نہیں کر لیتے؟"

کہنے لگا "اب تو میں بھی سوچتا ہوں شادی کر ہی ڈالوں۔ شاید لاہور کی آب و ہوا کا اثر ہے؟"

سعدیہ بولی "لاہور سے شادی کرائے بغیر تمہیں اب کراچی نہیں جانا چاہیئے، بولو کیسی لڑکی چاہیئے؟"

شام کو میں نے اپنی بیوی سے پوچھا کہ وہ اختر کے لئے لڑکی تلاش کرنے میں اتنی سرگرمی کیوں ظاہر کر رہی تھی، اختر سے یہ اس کی پہلی

ملاقات تھی، کہنے لگی "میں تمہارے اس دوست سے پہلی دفعہ ملی ہوں مگر میں نے آج تک اتنا اچھا آدمی نہیں دیکھا اور میں پورے بھروسے سے کہہ سکتی ہوں کہ وہ نہایت اچھا شوہر ثابت ہو سکتا ہے۔ اس لئے میں کسی بھی لڑکی کو جسے وہ پسند کرے نہ صرف اس کے لئے رضامند کرنے کو تیار ہوں بلکہ اختر کی ضمانت بھی دے دوں گی"

لاہور کے دو تین مہینے کے قیام کے دوران میں اس کی شادی کا مسئلہ اسی طرح چلتا رہا دوسرے تیسرے روز ہم جمع ہوتے تو یہ بات چل نکلتی، اختر کہتا تھا "تمہارے شہر میں اتنی خوبصورت لڑکیاں ہیں کہ میں انتخاب نہیں کر سکتا"

یہ بحث چل ہی رہی تھی کہ ایک روز اچانک اختر مرحوم کو لاہور سے کراچی واپس جانے کا حکم ملا۔ جس اخبار کے سلسلے میں وہ لاہور آیا تھا اس کی حالت خاصی خراب تھی اس لئے اس نے کراچی جانے کا فیصلہ کر لیا، مجھے یقین ہے وہ لاہور میں رہتا تو شاید اس کی زندگی کچھ بدل جاتی، بیگم ملک نورانی نے مجھ سے کئی دفعہ کہا تھا کہ "اختر کے گھر کے لوگ اس کی شادی کرنا چاہتے ہیں مگر وہ رضامند نہیں ہوتا" میں نے اور سعدیہ نے ان سب کو اچانک خوش خبری سنانے کا پروگرام بنایا تھا، افسوس ہے کہ اختر کو یکایک کراچی جانا پڑا اور یہ پروگرام

پایۂ تکمیل کو نہ پہنچ سکا اور چند ہی ماہ بعد اچانک اس کی موت کی خبر مل گئی۔ اب بھی جب اس کا خیال آتا ہے تو یقین نہیں آتا کہ وہ شخص جو اپنی زندگی کے بارے میں کبھی سوچتا تک نہیں تھا، جس نے کبھی کسی سے جھگڑا نہیں کیا، جس کا کوئی دشمن نہیں تھا بلکہ جو ہر شخص کو اپنا گرویدہ بنا لیتا تھا کیسے مر سکتا ہے، موت کا پنجہ کتنا بے رحم ہے جو اتنے پیارے آدمیوں کو بھی دبوچ لیتا ہے جن کے پیچھے رونے والوں کی قطاریں لگی رہتی ہیں۔

شاید بہت کم دوستوں کو اختر کے گھر کے یا اس کی ذاتی زندگی کے صحیح حالات معلوم ہوں، خود مجھے بھی کچھ زیادہ علم نہیں ہے، دس سال کی دوستی میں اس نے اپنی ذات کے بارے میں از خود شاید ایک دفعہ بھی بات نہیں کی۔ زندگی کے اس دور اور عمر کی اس منزل میں بہت کم لوگ اپنی ذات سے آگے سوچ سکتے ہیں لیکن اختر مرحوم میں اپنی عمر سے بہت زیادہ پختگی کے آثار تھے۔ اخبار نویسوں کی حالت بہتر بنانے اور مجموعی طور سے اس پیشے کی قدر و منزلت بڑھانے کی دھن اس پر اتنی زیادہ سوار تھی کہ اسے ان باتوں کے بارے میں سوچنے کا شاید موقعہ ہی نہیں ملا۔ اس کی ذہانت اور شعور کی پختگی اور اس کی عام مقبولیت کے پیش نظر اس کے لیے یہ کوئی مشکل بات نہ تھی کہ وہ

آسائش کی زندگی بسر کرنے کا اہتمام کر لیتا، گھر بنانا بسانا، روپیہ پیدا کرنا یا اچھی سے اچھی ملازمت حاصل کرنا اس کے لئے کوئی مشکل مسئلہ نہ تھا، تم سوچو ہم لوگ کتنے جھوٹے ہیں اور ہمارے کاموں اور روزمرہ کی سرگرمیوں میں ہمارے اپنے مفاد کا کتنا دخل ہوتا ہے، ہم کس طرح آسائشوں کے حصول کے لئے بھاگتے ہیں لیکن اختر نے اپنی ذاتی آسائش کا کبھی خیال تک نہیں کیا۔ اس کے برعکس اسے اپنے پیشے اور فن سے سچی محبت اور لگن تھی اور جن لوگوں کو اس کے صحیح شوق اور اس کا کام دیکھنے کا موقع ملا ہے، وہ بخوبی جانتے ہیں کہ اپنے کام میں بھی وہ اپنی عمر اور تجربہ کے مقابلے میں کہیں آگے تھا۔ جب ہم اسے صحافی کی نظر سے دیکھتے ہیں تو وہ ایک مثالی صحافی نظر آتا ہے، اگر ہم اسے اچھے انسان کے معیار پر پرکھیں تو وہ ایک صحیح اور سچا آدمی نظر آتا ہے جس میں تمام انسانی خوبیاں جمع ہو گئی ہوں، لوگوں کی محبت اور خدمت کا جذبہ عام انسانوں میں بھی ہوتا ہے لیکن کچھ لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں جو اپنے احساس اور شعور کے ہاتھوں مجبور ہو کر اپنے لوگوں کے کام آنے کی کوشش کرتے ہیں اور اس کے بغیر رہ نہیں سکتے، یہ لوگ اپنے لئے نہیں دوسروں کے لئے جیتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ دنیا میں سب کچھ ٹھیک ہو، لوگ ٹھیک رہیں، کوئی ناانصافی نہ ہو لیکن یہ سب کیسے ہو سکتا ہے؟ اس دنیا میں جو دکھوں اور

غموں کی آماجگاہ ہے جہاں قدم قدم پر رونے والے ملتے ہیں۔ ایسے لوگ کس طرح خوش رہ سکتے ہیں، جب کوئی آدمی پڑوسی کے دکھ میں اس حد تک شریک ہوتا ہو کہ اس کی تکلیف میں خود بھی مبتلا رہے اور جب کوئی آدمی اپنے ہم نفسوں اور اپنے آس پاس کے لوگوں کے ساتھ جینے اور مرنے لگے تو اس کا زندہ رہنا مشکل ہو جاتا ہے، زندگی گزارنے کے لئے جس بے حیائی کی ضرورت ہوتی ہے اس سے بہت کم لوگ عاری ہوتے ہیں لیکن پھر وہ لوگ وقت سے پہلے ہی سفر آخرت اختیار کر لیتے ہیں انہیں میں اختر مرحوم بھی تھا جو زندگی کے سفر کے آغاز ہی میں ہمیشہ کے لئے گم ہو گیا اور وہاں چلا گیا جہاں سے کبھی کوئی واپس نہیں آتا۔

عبداللطیف خاں (کشتہ)

حیاتِ اختر

محمد اختر، مرحوم، ۲۱ر اکتوبر ۱۹۲۶ء کو محلہ کٹرا۔ الہ آباد میں پیدا ہوئے۔ ان کا خاندان، الہ آباد کے قدیم شرفا و زمینداروں میں، ان تمام روایات کے ساتھ جو اس دور کے کھاتے پیتے گھرانوں کے لوازمات میں سے تھیں، ایک نمایاں خاندان تھا۔ ان کے جد امجد حاجی عبدالغفور مرحوم رئیس ہردوارہ، زمیندار ہونے کے ساتھ ہی ساتھ ایک باوقار تاجر بھی تھے۔ جنہوں نے بہ رسم تجارت کانپور میں اقامت اختیار کر لی تھی وہ بہت روشن خیال بزرگ تھے۔ انہوں نے اپنے بیٹوں کو تقاضائے وقت کے مطابق اعلیٰ تعلیم دلائی تھی۔ اختر مرحوم کے والد، عبدالحلیم صاحب حاجی صاحب کی اولاد میں سب سے چھوٹے ہیں۔ والدہ کی طرف سے بھی اختر مرحوم کا سلسلہ ایک نامور خاندان سے ملتا ہے۔ ان کے نانا عبدالقادر

مرحوم مسلم زمینداران ضلع الہ آباد میں ایک نمایاں مقام رکھتے تھے۔ یہ دونوں گھرانے بڑے پائے کے زمیندار اور تاجر ہونے کی وجہ سے ملازمت خصوصاً سرکاری ملازمت کو اچھی نظر سے نہیں دیکھتے تھے۔ چنانچہ عبدالحلیم صاحب نے بھی اپنے والد کے نقش قدم پر چلتے ہوئے کانپور میں تجارت شروع کی اور وہیں مقیم رہے۔

حلیم صاحب کے یہاں ان کی بڑی بیٹی کے بعد دو لڑکے ایک ایک دو دو سال کے ہو کر اللہ میاں کو پیارے ہو چکے تھے۔ اس لئے جب اختر پیدا ہوئے تو بڑی خوشیاں منائی گئیں۔ اور ان کی پرورش بڑے ناز و نعم کے ساتھ کی گئی۔ وہ محرم میں فقیر بنائے جاتے۔ منتیں مانی جاتیں اور بڑی دھوم دھام سے بڑھائی جاتیں۔ زمانہ طفولیت گزرا تو کچھ دن گھر پر پڑھانے کے بعد گورنمنٹ ہائی اسکول۔ کانپور میں داخل کرا دیئے گئے۔ مگر کانپور کی آب و ہوا راس نہیں آتی تھی۔ لہٰذا ننھیال میں الہ آباد بھیج دئے گئے۔ الہ آباد میں انہوں نے، سٹی۔ اے۔ وی ہائی اسکول میں داخلہ لیا۔ وہاں وہ اپنی محنت و ذہانت، اساتذہ کے ادب و احترام، ساتھیوں سے محبت اور سب کے ساتھ حسن سلوک کی وجہ سے بے حد ہر دلعزیز تھے۔ وہ پڑھنے لکھنے کے بہت شوقین تھے اور ان کا شمار اسکول کے ممتاز ترین ہونہار طالب علموں میں ہوتا تھا۔

سنہ ۱۹۴۲ء میں ہائی اسکول پاس کرنے کے بعد وہ گورنمنٹ انٹر کالج میں داخل ہوئے اور وہاں بھی تمام سماجی و ثقافتی تحریکات میں بڑے ذوق شوق کے ساتھ حصہ لیتے رہے۔ "تقریروں کے مقابلوں" میں انھوں نے کئی انعامات بھی حاصل کئے تھے۔ اس زمانہ میں انھیں ہاکی اور کرکٹ سے بڑا شغف تھا۔ اور وہ کالج کے منتخب کھلاڑیوں میں گنے جاتے تھے۔ کالج کی مختلف ٹیموں کے ساتھ انھوں نے یو۔پی کے بہت سے شہروں کا دورہ بھی کیا تھا۔

سنہ ۱۹۴۴ء میں انٹرمیڈیٹ پاس کر کے مرحوم، یونیورسٹی میں داخل ہوئے۔ کھیلوں سے ان کا لگاؤ، باوجود ڈاکٹروں کی ممانعت کے دوران تعلیم یونیورسٹی بھی بدستور رہا اور الہ آباد یونیورسٹی کی ٹیم کے ساتھ انھوں نے کلکتہ میں ہونے والے 'یونیورسٹی میچوں' میں شرکت کی۔

گھریلو ماحول اور اپنی فطری ذہانت کی بنا پر اور کچھ اس وجہ سے کہ جس زمانہ میں وہ کالج پہنچے ہیں طلبا کی جماعت میں سیاسی شعور بہت بیدار ہو چکا تھا، مسلمانوں میں تحریک پاکستان نہایت زور پکڑ چکی تھی۔ تمام مسلم طلبہ مسلم اسٹوڈینس فیڈریشن کے تحت جمع ہو رہے تھے اور ان میں ترقی پسند عناصر، پاکستان کی تحریک کو جمہوری شکل دینے میں نمایاں حصہ لے رہے تھے، مرحوم کو ملک کے سیاسی مستقبل سے بڑی گہری دلچسپی پیدا ہو گئی اور

انھوں نے بڑے جوش و خروش کے ساتھ، اپنے آپ کو اس تحریک سے وابستہ کر دیا۔ اور وہ 'فیڈریشن' کے 'سکریٹری' منتخب ہو گئے۔

انھوں نے 'سکریٹری' شپ کے فرائض بڑی دلچسپی اور بیحد سرگرمی کے ساتھ انجام دیئے اور پوری پوری کوشش کی کہ ۱۹۴۵ء میں جو اسمبلی کے عام انتخابات ہونے والے ہیں، ان میں مسلم لیگ کے ٹکٹ صرف مخلص کارکنوں کو دیئے جائیں۔ اور جب اس سلسلہ میں 'مسلم لیگ' کا 'پارلیمنٹری بورڈ' نواب اسمٰعیل خاں مرحوم کی سرکردگی میں الہ آباد پہنچا تو مرحوم مسلم اسٹوڈینس فیڈریشن کا ایک وفد لے کر نواب صاحب موصوف سے ملے۔ اور انھوں نے زور دیا کہ مسلم لیگ کے پلیٹ فارم سے نوابوں اور جاگیر داروں کی بجائے، عوامی کارکنوں کو اسمبلی میں بھیجا جائے۔ لیکن جب نمائندوں کا انتخاب ہوا اور ان کی نظر میں بیشتر وہی پرانے شاطر بساط سیاست پر چھا گئے جو ہمیشہ قومی ترقی میں حائل ہوتے رہے۔ تو انھیں بڑی مایوسی ہوئی اور انھوں نے یونیورسٹی پہنچنے کے بعد، مسلم اسٹوڈینس فیڈریشن، کے بہت سے ترقی پسند طلبا کی طرح، اس جماعت سے اپنا تعلق منقطع کر لیا اور وہ 'اسٹوڈینٹس فیڈریشن' میں شامل ہو گئے۔ اور اس میں بڑے ولولہ اور اور انہماک کے ساتھ کام کرتے رہے۔ ۱۹۴۶ء میں جو آل انڈیا اسٹوڈینٹس فیڈریشن، کی کانفرنس، دہلی میں منعقد ہوئی، اس میں انھوں نے الہ آباد

کے وفد کی قیادت کی۔

۱۹۴۹ء میں انھوں نے الہ آباد یونیورسٹی سے 'بین الاقوامی تعلقات' میں ایم۔اے کیا اور کراچی چلے آئے۔

کراچی آئے تو انگریزی روزنامہ 'ڈان' سے وابستہ ہوگئے اور وہاں چند ہی روز میں اپنی ذہانت، محنت و جفاکشی کی بدولت ایک نمایاں حیثیت پیدا کرلی۔ ڈان میں وہ اسپورٹس رپورٹر کھیلوں کے نامہ نگار تھے۔ کھیلوں کے روزانہ واقعات کے علاوہ، وہ اس زمانے میں "اختر" کے نام سے ایک تبصرہ بھی لکھا کرتے تھے۔ جو کھیلوں سے مذاق رکھنے والے حلقوں میں بڑی دلچسپی سے پڑھا جاتا تھا۔

۱۹۵۳ء میں جب طلبا کی تحریک نے زور پکڑا تو مرحوم کے چھوٹے بھائی ڈاکٹر محمد سرور اس وقت میڈیکل کالج کے طالب علم اور اس تحریک کے ممتاز لیڈر تھے۔ ان کے متعلق الطاف حسین صاحب ایڈیٹر ڈان نے اختر مرحوم سے کہا کہ "آپ اپنے بھائی کو اس تحریک میں اس قدر نمایاں حصہ لینے سے باز رکھیں"۔ مرحوم نے ایسا کرنے سے انکار کردیا اور ڈان سے علحدگی اختیار کرکے روزنامہ ٹائمز آف کراچی سے منسلک ہوگئے۔ ..... وہاں اسپورٹس کے علاوہ دوسرے شعبوں کی نامہ نگاری بھی ان

کے ذمہ تھی۔ اور بڑی حد تک انہیں کی مساعی کی بدولت ۵۵ء سے ۵۸ء تک ملک کے سیاسی واقعات کے سلسلہ میں ٹائمز آف کراچی کی خبروں کو نمایاں مقبولیت حاصل رہی۔ مسلم لیگ اور ری پبلکن پارٹی کی مشترکہ وزارت کے خاتمہ کی خبر سب سے پہلے اختر مرحوم ہی نے دی تھی۔

۵۷ء میں چھ مہینے کے قریب وہ ٹائمز آف کراچی کے نامہ نگار کی حیثیت سے لاہور میں بھی تعینات رہے۔ ٹائمز کی ملازمت کے دوران ہی وہ سیکورٹی آف پاکستان ایکٹ کے تحت یکم جون ۵۴ء کو 'کراچی جیل' میں نظر بند کر دیئے گئے تھے جہاں سے کوئی پونے دس مہینے کے بعد ۱۹ر مارچ ۵۵ء کو 'چیف کورٹ' کے حکم سے رہا ہوئے

فروری ۱۹۵۸ء میں روزنامہ 'لیڈر' کا اجرا ہوا تو وہ اس کے 'نامہ نگار اعلیٰ' مقرر ہو گئے اور آخر دم تک اسی سے منسلک رہے۔

۱۶ر دسمبر ۱۹۵۸ء بروز سہ شنبہ وہ اچھے خاصے گھر سے دفتر گئے اور رات کو حسب معمول واپس آئے تو نمونیہ میں مبتلا ہو گئے۔ دوسرے ہی دن ان کو 'جناح ہاسپٹل' میں داخل کرا دیا گیا۔ بھائی، بہنوئی اور پھر 'جناح ہاسپٹل' کے ماہر و تجربہ کار ڈاکٹروں نے نہایت دلسوزی سے علاج کیا۔ مگر ان کی حالت سنبھل نہ سکی۔ اور وہ ۲۰۔ دسمبر ۵۸ء کو بروز شنبہ ساڑھے نو بجے صبح، پھیپھڑوں میں سانس کی آمد و رفت

مسدود ہو جانے کے باعث انتقال کر گئے۔ شام کے ۴ بجے نماز جنازہ ہوئی اور وہ لالو کھیت کی، خاموش کالونی، میں سپرد خاک کر دیئے گئے۔

باوجود بارش و سردی کے ان کے بکثرت دوست، اعزا، رشتہ دار اور وناقی دار الحکومت کے قریب قریب تمام صحافی شریک جنازہ تھے۔

۲۳ دسمبر بروز سہ شنبہ صبح کے وقت مرحوم کی رسم سوم ان کے مکان پر ادا ہوئی۔ 'لیڈر' کا دفتر ان کے سوگ میں بند رہا۔ علاوہ اعزا واحباب کے (کہ انھوں نے بے شمار تعزیتی خطوط بھیج کر مرحوم کی وفات حسرت آیات پر اظہار رنج و غم کیا)۔

وزیر اطلاعات حکومت پاکستان نے پیغام تعزیت بھیجا۔ پاکستان کے محکمہ اطلاعات کے افسروں نے جلسہ تعزیت کیا۔ بہت سے غیر ملکی سفارت خانوں اور خبر رساں ایجنسیوں اور شعبہ ہائے اطلاعات نے اظہار رنج و ہمدردی کیا۔ مشرقی و مغربی پاکستان کی ساری صحافتی انجمنوں، کھیل کی ایسوسی ایشنوں اور کلبوں نے جلسہ ہائے تعزیت کر کے مرحوم کو خراج عقیدت پیش کیا۔

انجمن صحافیان کراچی نے مرحوم کی یاد تازہ رکھنے کے لئے ہر سال دسمبر میں مضمون نویسی کا مقابلہ کرا کے انعام دینے کا فیصلہ کیا۔ دسمبر ۵۹ء میں بہ عنوان، نظام تعلیم کی خرابیاں، پہلا مقابلہ مضمون کو یسی

ہو رہا ہے۔ جس میں اوّل دوم سوم آنے والوں کو ملی الترتیب سو، پچھتر اور پچاس روپیہ بطور انعام دیا جائے گا۔

اختر مرحوم نے نو دس سال کی مختصر مدت میں میدان صحافت میں ایک خاص مقام حاصل کر لیا تھا۔ وہ اسپورٹس پر لکھنے والوں کی صف اوّل میں شمار ہوتے تھے۔ ان کی انشا پردازی اور بیباک رائے زنی کا سکہ لوگوں کے دلوں پر بیٹھا ہوا تھا۔ وہ کراچی میں ڈان، ٹائمز آف کراچی اور 'لیڈر' میں اسپورٹس کے باقاعدہ کالم نویس ہونے کے علاوہ ہندوستان کے مشہور ہفتہ وار 'اسپورٹس اینڈ دسٹ ٹائم' کے لئے بھی ایک ہفتہ وار 'پاکستان نیوز لیٹر' لکھا کرتے تھے۔ جو ان کے نام سے شائع ہوتا تھا۔ اور ڈھاکہ کے بنگالی روزنامہ سنگباد، اور انگریزی ہفتہ وار 'نیوز ورلڈ' کی نمائندگی کے فرائض بھی انجام دیتے تھے۔ ریڈیو پاکستان، اکثر کھیلوں پر ان کے تبصرے نشر کیا کرتا تھا۔

کھیلوں کے علاوہ سیاسی رپورٹنگ میں بھی وہ ایک ماہرانہ شخصیت کے مالک تھے۔ انتقال سے تھوڑے عرصہ قبل انہوں نے 'لانگ فیلو' کے نام سے چودھری، خلیق الزماں، حمید الحق چودھری، این۔ ایم۔ خان، کاردار، ڈاکٹر سلیم الزماں صدیقی اور غلام فاروق صاحبان پر جو تعارفی مضامین لکھے تھے، وہ تعلیم یافتہ طبقہ میں بہت پسند کئے گئے۔

انھیں صحافیوں کی فلاح و بہبود کا بے حد خیال تھا، وہ ان کے حالات کی بہتری کی جد و جہد میں ہمیشہ پیش پیش رہے اور کئی سال تک 'انجمن صحافیان' کی مجلس عاملہ کے رُکن اور آخری دو سال اس کے 'جنرل سکریٹری' رہے۔

جب عامل صحافیوں کی ایک متبادل جماعت وجود پذیر ہوئی اور دوسرے ناسازگار حالات پیش آئے تو ان کا مردانہ وار مقابلہ کیا اور اپنی انتھک کوششوں سے انجمن کی قوت عمل میں فرق نہیں آنے دیا۔ وہ بیماری کے دن تک 'پریس کمیشن' کے لئے انجمن کے متعلق یادداشت کی تیاری میں مصروف رہے۔ 'پاکستان فیڈرل یونین آف جرنلسٹ' اور 'کراچی کلب' کے قیام میں بھی ان کا نمایاں حصہ تھا۔

اختر مرحوم باوجود زمیندارانہ ماحول میں تربیت پانے کے نہایت رقیق القلب اور منکسر المزاج آدمی تھے۔ ان کا نصب العین، انسانیت کی ہمہ گیر بہبود میں مضمر تھا۔ ان کے نزدیک زندگی عام انسانوں کی مجموعی جد و جہد کا نام تھا۔

وہ مشرقیت کے دلدادہ تھے۔ ان کی نظر میں مشرقی تہذیب میں اگر کچھ خامیاں تھیں تو محاسن اور خوبیاں بھی۔ ان کی طبیعت میں وہ عنصر بہت نمایاں تھا جس کو "وضعداری" کہتے ہیں۔ خودداری و رواداری

اور اپنے نظریات پر (جن کو انھوں نے بہت غور و خوض کے بعد قائم کیا تھا) یقین محکم ان کا مزاج تھا۔ وہ مروتِ بے جا کے قطعی قائل نہیں تھے اور کبھی کسی کے لئے حتیٰ کہ اپنے لئے بھی کوئی ایسا کام کرنے کے واسطے تیار نہیں ہوتے تھے جسے ان کا ضمیر قبول نہ کرتا ہو۔ یا جسے کرنے کے بعد انھیں اس کی صحت و جواز کے وجود تلاش کرنا پڑیں۔

اپنے خاندان کی لڑکیوں میں لکھنے پڑھنے کا شوق سب سے پہلے انھیں نے پیدا کیا۔ وہ چاہتے تھے کہ لڑکیاں خوب پڑھیں اور خوب کام کریں۔ وہ عورتوں کے لئے سماجی بہبود کے کاموں میں حصہ لینے کو بڑی وقعت کی نظر سے دیکھتے تھے۔ لیکن کسی کام کے لئے مارے مارے پھرنے یا خود کو بہت نمایاں کرنے کو چھچھورا پن تصور کرتے تھے۔

وہ محبت، خلوص اور ایثار کا ایک مجسمہ تھے۔ بیگانوں سے بھی یگانوں جیسا سلوک کرتے اور ہر شخص کے کام آنے کو ہمہ وقت آمادہ رہتے۔ ان کا دل اپنے بنی نوع کے لئے ہی نہیں جانوروں کے لئے بھی محبت سے لبریز تھا۔ ایک مرتبہ کہیں سے ایک چلتی پھرتی بلی آگئی۔ اور اختر صاحب نے اس کی دیکھ بھال اپنے ذمے لے لی۔ اس کو دودھ پلایا جاتا اور اس کی خوب خاطر کی جاتی۔ اس کے آرام کا انتہائی خیال رکھا جاتا۔ گھر والے رات کو کرسیوں کی گدیاں ہٹا دیتے کہ وہ بیٹھ کر گندہ نہ کر دے۔ آپ دفتر سے

لوٹتے تو پہلے اُسے دودھ پلا کر کوئی گدی تلاش کرتے۔ نہ ملتی تو اپنا کمبل بچھا کر اسے سُلا دیتے اور پھر اپنی ضروریات کی طرف متوجہ ہوتے۔ اس نے بھی ان کے ساتھ حق وفا ادا کر دیا۔ جس دن مرحوم نے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے گھر کو خیرباد کہا۔ وہ بھی ایسی غائب ہوئی کہ پھر پتہ نہ چلا۔

مرحوم بہت ہی دلکش اور جاذب نظر شخصیت کے مالک تھے۔ چھ فٹ سے نکلتا ہوا قد، پُرگوشت جسم، سُرخی مائل گندمی رنگ، خدوخال نہایت شگفتہ، کتابی چہرہ، بڑی بڑی چمکدار آنکھیں، کھڑی ناک، سر پہ ملائم گھونگھریالے بال، کشادہ و بلند پیشانی۔ چہرہ پر بشاشت اور آزادہ مزاجی ٹپکتی ہوئی۔ نہایت متناسب الاعضا اور ہمہ گیر قہقہہ لگانے والے انسان تھے۔ ہنستے تو ان کی ہنسی کے ساتھ ان کا سارا وجود ہنستا تھا۔ جب وہ لمبے لمبے ڈگ رکھتے ہوئے چلتے تو ان کی رفتار میں بڑی دلاویزی پیدا ہو جاتی تھی۔

انہیں سادہ اور دیسی کھانوں سے بہت رغبت تھی۔ مرغن اور انگریزی طرز کے کھانوں سے بے حد گھبراتے تھے۔ مطالعہ کے بے حد شوقین تھے۔ سیاسیات، ادبیات، مذہبیات اور تاریخ کے مطالعے سے خاص دلچسپی رکھتے تھے۔

مرحوم کی ابھی شادی نہیں ہوئی تھی۔ ان کے پسماندگان میں

ان کے والد، والدہ، پانچ بہنیں اور چھوٹے بھائی ڈاکٹر محمد سرور (ایم۔بی۔بی۔ایس) ہیں۔

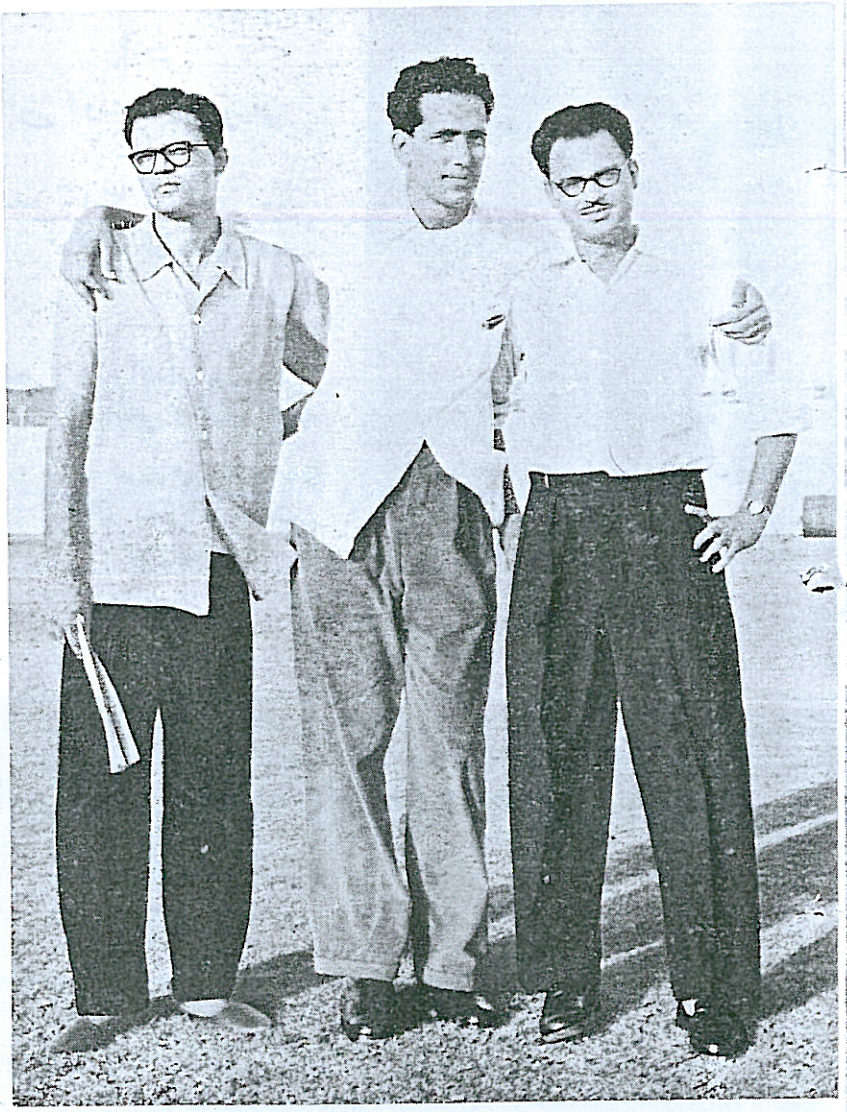

یہ بھی ایک یاد گار تصویر ہے

اختر درمیان میں ہیں - دھنے ہاتھ پر زوّار نظر آرہے ہیں

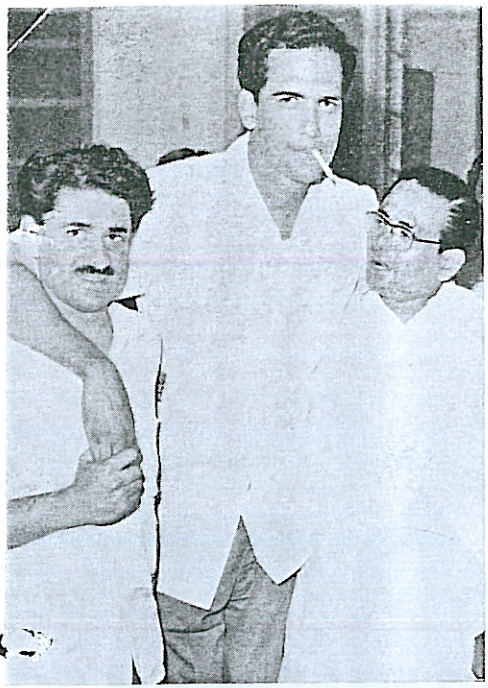

اختر
اپنے دوستوں کے درمیان

سامنے : ایک طرف مشیر ہیں
ایک طرف سید احمد

نیچے : (الہ آباد) یونیورسٹی
کے زمانے کا ایک گروپ

بائیں سرے پر اختر ہیں
درمیان میں عابد کاظمی
کھڑے ہیں

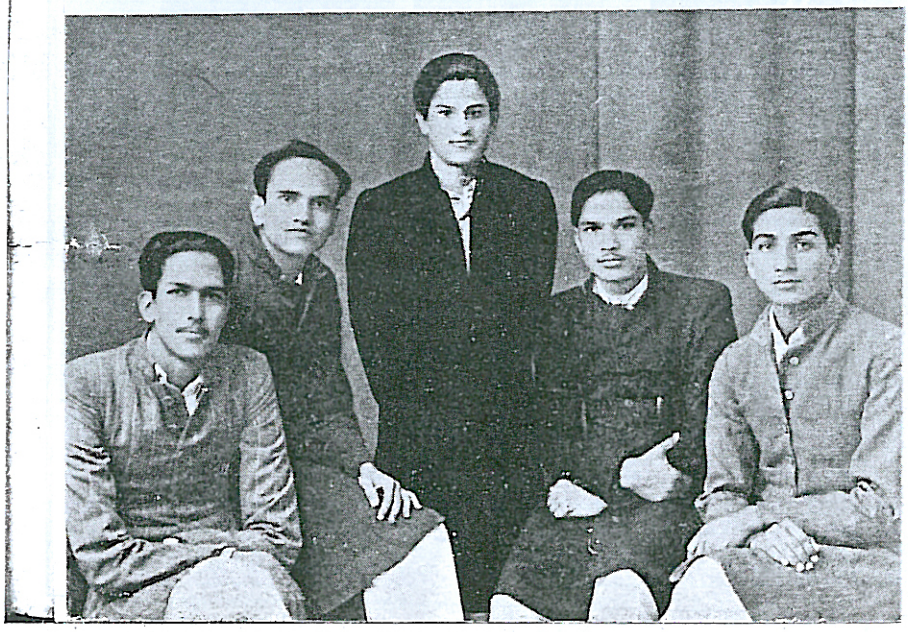

عزیزوں کے آنسو

والدہ اختر مرحوم

میرا لاڈلا

اختر کی زندگی کے بارے میں جتنا میں سمجھ سکتی ہوں ظاہر ہے کہ کوئی بھی نہیں سمجھ سکتا۔ لیکن اس کے بارے میں اگر میں سینہ پر پتھر رکھ کر اپنے خیالات لکھوں جب بھی ناممکن ہے۔

میں الہ آباد کے ایک زمیندار گھرانے میں پیدا ہوئی۔ شادی بھی الہ آباد کے چوٹی کے زمیندار گھرانے میں ہوئی۔ اپنے گھر میں سب سے چھوٹی ہونے کی وجہ سے بے انتہا لاڈ پیار میں رہی۔ اسی وجہ سے میرے والد مجھے کبھی سسرال میں نہیں رہنے دیتے تھے۔ میرے بچوں نے ننہیال میں آنکھ کھولی اور وہیں پلے بڑھے۔ میری سب سے بڑی لڑکی صادقہ تھی۔ اس کے بعد دو بچے اور پیدا ہوئے۔ جو کہ بچپن میں ہی اللہ کو پیارے ہو گئے۔ اس کے بعد میرے

سب سے زیادہ لاڈلے بیٹے کی پیدائش ہوئی۔ اختر کی پیدائش کچھ اس آن بان سے ہوئی۔ کہ اس وقت سے وہ لوگوں کی پیار اور محبت کا مرکز بن گئے۔ پیدائش کے چودہ گھنٹے کے بعد ہی سے اس بچے نے ایسی سخت اور جان لیوا بیماریاں پائیں کہ زندگی کی کوئی امید نہیں رہی۔ الہ آباد اور کانپور کے تقریباً تمام بڑے بڑے ڈاکٹروں کے زیر علاج رہے۔ نانا اور ماموں نے علاج اور تیمارداری میں دن رات ایک کر دیا۔ خالہ، نانی نے منتوں کے مانگنے میں کوئی کسر نہ اُٹھا رکھی۔ اس وقت ان کی زندگی تھی۔ اور سب کی دعائیں شامل تھیں۔ میرا بچہ صحتیاب ہوگیا۔

اختر میں بچپن ہی سے کچھ ایسی غیر معمولی ذہانت۔ اور شوخی تھی جو عموماً سب بچوں میں نہیں پائی جاتی۔ صادقہ میری بڑی لڑکی گڑیوں وغیرہ سے کھیلا کرتی۔ آپ باہر سے کھیلتے کودتے آتے اور بس توڑ پھوڑ کر پھینک دیتے۔ صادقہ رونا دھونا شروع کر دیتیں آپ صرف اتنا کہہ کر بھاگ جاتے "بڑے ابا کہتے ہیں کہ مورتیوں کو گھر میں نہیں رکھنا چاہیئے اور آپا ان سے کھیلتی ہیں"۔ اتنا اودھم مچانے پر بھی کوئی ان کو کچھ نہ کہتا اور صادقہ کو سب بہلا پھسلا کر چپ کرا دیتے۔ اسی طرح سفر سے بھی معمولی معمولی باتوں پر جھڑپ ہوتی رہتی۔ لیکن کوئی انھیں کچھ

نہ کہتا سب سرور کو ہی بہلا کر یا ڈانٹ کر سمجھا دیتے کہ تمہارا بڑا بھائی ہے۔

دس گیارہ برس کی عمر میں ریڑھ کی ہڈی پر اچانک پھوڑا نکل آیا۔ الہ آباد اور کانپور کے ڈاکٹروں نے جواب دے دیا کہ مرض لاعلاج ہے۔ ان کی بیماری سے سارے خاندان میں کھلبلی مچ گئی۔ دُعا۔ دَوا میں کوئی کسر نہ اُٹھا رکھی گئی۔ روز ایک بکرا ذبح کر کے محتاجوں میں بانٹا جاتا۔ ان کے سرہانے پیسے رکھے جاتے اور پھر وہ غریبوں میں بانٹے جاتے۔ اُس وقت جب کہ مرض لاعلاج تھا تو وہ اچھا ہو گیا۔ شائد اسی لئے کہ بڑھاپے میں ماں باپ کو اتنا بڑا صدمہ سہنا پڑے۔

عموماً دیکھا جاتا ہے کہ لاڈ پیار میں بچے کچھ نہ کچھ بگڑ جاتے ہیں۔ اور پڑھنے وغیرہ کا بالکل شوق نہیں رہتا لیکن اختر اتنے ناز نخرے میں پلنے کے باوجود اپنی عمر سے زیادہ سمجھدار، ہوشیار اور ذہین تھا۔ کافی بڑے ہونے کے بعد تک نانا پیدل نہیں چلنے دیتے تھے ہر وقت اپنی گود میں رکھتے تھے۔ اور جب ان سے کہا جاتا کہ "آپ تھک جاتے ہیں اُتار دیا کیجئے وہ پیدل چلے گا" تو کہتے کہ "میں نہیں تھکتا وہ پیدل چلنے سے تھک جائے گا"۔

دس گیارہ سال تک کچھ ایسی بیماریوں کا سلسلہ رہا کہ پڑھنے

کو منع کر دیا گیا۔ اس کو چین نہیں پڑا اس وقت عمر کیا تھی؟ لیکن پہ پ کر اپنے آپ جا کر سکول میں داخلہ لے لیا۔ بچپن سے ہی خود پڑھنے لکھنے اور دوسروں کو پڑھانے لکھانے سے بہت اُنسیت تھی۔ اسکول میں ہمیشہ اپنے ساتھیوں میں ہر اعتبار سے نمایاں رہتا۔ پڑھنے کے علاوہ کھیل کود کا بہت شوقین تھا۔ اپنی پڑھائی کے زمانے تک ہمیشہ کھیلوں کے مقابلے میں انعامات حاصل کرتا رہا۔ باتیں کرنے کا بہت شوقین تھا۔ بچپن سے ہی دوستوں کو دن دن بھر کے لئے اکٹھا کر لیتا اور ان کے ساتھ گپیں ہوتی رہتیں۔ کھانے کھلانے۔ اور پہننے اوڑھنے کا بہت شوق تھا۔ دوستوں کی دعوتیں کرنے میں اسے خاص لطف ملتا تھا۔ طبیعت میں فراخدلی اس قدر کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ کہ بعض دفعہ سب لوگ اس پر جھنجھلا اُٹھتے۔ بچپن کا ایک واقعہ ہے کہ ایک فقیر سڑک پر صدائیں لگا رہا تھا۔ آپ اُٹھے اور سامنے ہی ٹنگی ہوئی اپنے ابا کی نئی سوئٹر اُٹھا کر دے دی۔ بعد میں میرے آنے پہ چھوٹے بچوں نے شکائتیں کیں۔

ان کا گھر میں جو رتبہ تھا اُس کو صرف گھر والے ہی سمجھ سکتے ہیں۔ خاندان بھر میں نہ صرف یہ کہ ان کا لاڈ پیار تھا بلکہ سب لوگ ان کی عزت کیا کرتے تھے۔ ہر چھوٹی بڑی بات میں ان کے مشورے کا شامل ہونا ضروری تھا۔ ان کی عزت، قدر اور لاڈ پیار صرف اپنے گھر تک ہی محدود

نہیں تھا بلکہ دوست اور رشتہ دار بھی محبت کرتے تھے۔ بچپن سے اب تک ان کے جتنے دوست تھے سب ان کو بہت چاہتے اور بے انتہا عزت کرتے۔ رشتہ دار بھی ہمیشہ خلوص اور محبت کی نظر سے اسے دیکھتے۔

اختر شاید ایک فرشتہ بن کر میرے گھر میں پیدا ہوا۔ شکل وصورت کے بارے میں تو سب ہی جانتے ہیں کہ وہ جتنا خوبصورت تھا۔ اس کا دل شائد اس سے بھی اچھا تھا۔ اتنی چھوٹی سی عمر میں ہی اپنے گھر اور باہر کے لئے ہر ممکن کام کر گیا۔ گھر کے ایک ایک فرد کا بے انتہا خیال رکھتا۔ اس کے دم سے گھر میں ہر وقت کام جاری رہتا۔ اور اگر میں کبھی وقت بے وقت لیٹ جاتی تو فوراً خیال کرتا اور مجھسے پوچھتا "اماں! کیا طبیعت ٹھیک نہیں ہے؟" گھر میں اگر کسی کی معمولی سی طبیعت بھی خراب ہوتی تو پریشان ہو جاتا۔ تنخواہ ملتے ہی پوری تنخواہ مجھے لا کر دے دیتا۔ اور پھر حسب ضرورت اس میں سے مانگ کر لے جاتا۔ کبھی کوئی چیز خریدنی ہوتی تو نہایت بھولے پن سے آکر پوچھتے "بھئی اماں مجھے یہ چیز خریدنا ہے پیسے ہیں؟" اور جب وہ چیز آجاتی مثلاً کپڑا وغیرہ تو گھر کے ہر ایک فرد سے رائے لی جاتی کہ کیسی چیز ہے۔ کپڑا پہن کر بہنوں کو ہنساتا۔ فخر سے دکھاتے "کیوں بھئی کیسا ہے؟ اس کے بعد آپا کے یہاں جاتے کیوں بھئی آپا یہ آپ کو پسند آیا۔ کیسا ہے؟ غرض کہ جب تک کہ وہ ہر ایک کی رائے نہ لے لیتا اُسے

چین نہ آتا۔

ان کو اماں سے کچھ ایسا لگاؤ تھا کہ گھر میں گھستے ہی اماں کہاں ہیں، کچھ اس طرح پوچھتے جیسے کوئی چھوٹا بچہ ہو اور میں جواب میں فوراً دوڑتی "ہاں بھیا" ایک سال پہلے وہ کراچی آگیا۔ میرا الہ آباد میں رہنا دشوار ہوگیا۔ ان کے بغیر وہاں ایک پل کو بھی چین نہیں پڑتا تھا۔ اور ہر خط میں میرا بچہ مجھ کو لکھتا "اماں یہاں آپ کو بہت تکلیف ہوگی، آپ ہرگز نہ آئیے" اس وقت اس نے میری تکلیف کا کتنا خیال کیا۔ اور اب وہ اتنی دور پہنچ گیا کہ اتنے بڑے پہاڑ گرنے کا خیال بھی نہ کیا۔

اختر ہمیشہ ہر حال میں خوش رہتا۔ کالونی میں اتنا چھوٹا سا گھر تھا۔ ہر طرح کی تکلیف تھی لیکن اس میں بھی میرا بھیا ہمیشہ خوش رہتا۔ اتنے چھوٹے سے مکان کے باوجود ہمیشہ دوستوں کا جمگھٹا لگا رہتا۔ روز دعوتیں کرتا۔ اور اس پر بہنیں بے حد خفا ہوتیں کہ بھائی آپ اتنے خراب اور چھوٹے سے مکان میں سب کو بلاتے ہیں، اس کا جواب ہمیشہ اس طرح دیتے "بھئی جب ہم خود یہاں رہتے ہیں تو ہمارے دوستوں کو یہاں آنے میں کیا اعتراض ہو سکتا ہے اور جس کو ناپسند ہو وہ نہ آئے" طبیعت حد درجہ خوددار تھی اور خود پر بھروسہ تھا۔ اس کا دماغ اتنا سلجھا ہوا تھا۔ کہ مشکل سے مشکل کام میں اس کا مشورہ ہی کام آتا۔

اتنی کم عمری کے باوجود پورے خاندان کے سردار وہی تھے۔ اپنے سے چھوٹوں کو ہمیشہ اچھی سے اچھی راہ دکھاتے۔ سب کو پڑھایا لکھایا۔ سب کچھ کیا۔ لیکن خود اس دُنیا میں کوئی عیش چین نہیں کیا۔ دوسروں کے لئے سب کچھ کر گئے۔ ہر وقت مجھے ایسا لگتا ہے کہ فوراً میرا بچہ مجھے آواز دے گا "آماں"! ہر وقت مجھے اس کے قدموں کی آواز کا انتظار رہتا ہے۔ اس کا قد و قامت اس کی شکل و صورت ہر وقت ذہن میں گھومتی رہتی ہے اور ہر وقت یہ یقین رہتا ہے کہ میرا بچہ جلد سے جلد آجائے گا۔ ایسا لگتا ہے کہ وہ بے موت رخصت ہو گیا۔ میرا بچہ اس وقت عالم بالا میں پہنچ چکا لیکن میں ہر سکنڈ اس کے انتظار میں بیٹھی رہتی ہوں، ہر وقت وہی میرے ذہن میں بسا رہتا ہے۔ میرا بچہ میرے سامنے کس طرح چلا گیا۔ اب میرے لئے یہ دُنیا ایک دوزخ سے کم نہیں ہے۔ میرے دل کی تڑپ کا اندازہ شائد کوئی نہیں کر سکتا۔ اتنے بڑے جوان کو دے کر میرے لئے یہ زندگی اجیرن ہے۔ ہر وقت خدا سے یہی دعا ہے کہ وہ مجھے اپنے پاس جلد سے جلد بُلا لے۔

ڈاکٹر وحید الدین

اختر کی یادیں

۱۹۳۵ء میں میں نے الہ آباد گورنمنٹ کالج سے تعلیم مکمل کی اور لکھنؤ ڈاکٹری کی تعلیم کے لئے چلا گیا۔ الہ آباد کے دوستوں اور رشتہ داروں سے تقریباً چھ سال تک جدا رہا۔ اسی دوران میں اختر میاں کی پیدائش ہوئی۔ کسی کو کیا خبر تھی کہ یہ لڑکا میری زندگی اور میرے اہل وعیال کی زندگی پر اتنا گہرا اثر ڈالے گا۔

اختر میاں سے رشتہ داری پہلے ہی سے تھی۔ یہ محلہ کٹڑہ میں اپنے ماموں، بھائی عبداللطیف صاحب کے یہاں رہتے تھے۔ میرا آنا جانا بھائی صاحب کے یہاں اکثر ہوتا رہتا تھا اور یہ بھی کھیلتے کودتے نظر آتے اور ان سے بھی گفتگو ہوتی۔ بہت ہی تمیز دار خوش مزاج اور با اخلاق تھے۔ مل کر طبیعت خوش ہو جاتی۔ ان کی آپا جان سے میری

شادی ہونے کے بعد رشتہ قریب تر ہوگیا اور آنا جانا بیشتر ہونے لگا، اختر میاں سے ملاقات زیادہ رہنے لگی۔ کھیل کود میں دلچسپی، پڑھنے میں انہماک، طبیعت مائل بہ شرارت اسی وقت سے تھی۔ ہر شرارت سے ذہانت ٹپکتی۔ گھر میں ۔ یہ پہلے اور اکیلے لڑکے تھے۔ لاڈ بہت تھا اس لئے طبیعت میں بیباکی آنے لگی تھی۔ گھر کے اور بچے مٹی کے کھلونے، گائے، بیل، چڑیاں، ہندوؤں کے دیوتا وغیرہ لاکر اپنے گھروندے کو آراستہ کرتے اور ان کو موقع ملتا تو یہ سب کچھ آنگن میں جاکر ان کا چورا کر دیتے۔ پوچھ گچھ پر بے باکی سے جواب دیتے کہ "آپ ہی نے تو کہا تھا کہ مورتیاں گھر میں رکھنا گناہ ہے"۔

گرمی کے دنوں میں مٹی کے نئے نئے گھڑوں میں پانی بھر کر ٹھنڈا ہونے کے لئے رکھا جاتا۔ اختر جاتے اور ان کے پیندوں میں کیل ٹھونک کر چھید کر دیتے۔ تمام پانی بہہ جاتا۔ ان کو بڑا لطف آتا۔ اسی طرح کی شرارتیں اکثر کرتے اور بڑے نڈر ہو کر کرتے۔

بھائی عبداللطیف صاحب کا اثر اختر میاں کی تعلیم و تربیت پر بہت نمایاں رہا۔ ماموں صاحب علی گڈھ کے تعلیم یافتہ، سلجھے ہوئے دماغ اور اچھی سوجھ بوجھ کے مالک تھے۔ سیاست میں خوب حصہ لیتے رہتے۔ الہ آباد بلدیہ کے برسوں ممبر رہے اور کچھ عرصہ بلدیہ اور

ڈسٹرکٹ بورڈ کے 'تعلیمی شعبہ' کے 'صدر' بھی رہے۔ ان کے یہاں اخبار، رسالے اور اسکول کی کتابیں بکثرت رہتیں۔ ان سب کے پڑھنے کا اختر کو موقعہ ملا اور اس سے انہوں نے پورا فائدہ اُٹھایا

جب ماموں صاحب الکشن میں حصہ لیتے بڑا زور شور رہتا اور خوب اہتمام ہوتا۔ اختر میاں تمام مصروفیات میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے۔ ماموں صاحب پختہ قسم کے کانگریسی کھدر پوش۔ ان کے دل میں ملک کا درد، ایثار کا جذبہ غرض ایک محب وطن کے سے تمام اوصاف موجود تھے اور یہی تمام نقوش اختر میاں کے دماغ پر نقش ہوتے چلے گئے اور بہت جلد یہ ایک ذہین، بیباک، با اخلاق، بامروت وسیع الخیال اور آزاد طبع نوجوان بن گئے۔ کالج کے با اثر طالب علموں میں ان کا شمار کیا ہوتا تھا۔

حسین، تندرست، قدآور، صاف رنگ، گھونگریالے بال اور مسکراتا ہوا چہرہ کبھی نہیں بھولا یا جاسکتا۔ ان کے دل میں محبت کی بہتات تھی۔ تمام اعزا کو قطعی اپنا سمجھتے۔ والدین اور بھائی بہنوں سے بے حد محبت کرتے۔ خاص کر اپنی آپا پر تو جان دیتے۔ ان بہن بھائی کی محبت تو ضرب المثل ہے۔

میں ملازمت پر جہاں بھی ہوتا ان کی آپا میرے ساتھ ہوتیں وہیں

اسکول کالج کی چھٹیاں گذارنے ان کے پاس آجاتے۔ میرے کراچی ہجرت کرنے کے بعد ان کی آپا کی محبت نے ہی ان کو یہاں گھسیٹا اور یہ بھی یہاں آگئے۔

الہ آباد یونیورسٹی کے ایم۔اے تھے۔ یہاں آتے ہی روزنامہ 'ڈان' میں رپورٹر کی جگہ مل گئی۔ ذہین اور بیباک تو تھے ہی اجفاکشی اور محنت نے ان کو ایک کامیاب صحافی بنا دیا۔ اخباری دنیا میں آکر ان کے خیالات میں اور وسعت و پختگی آگئی۔ دوسروں کی امداد، ان کو پستی سے ابھارنا، ان کو ان کے حقوق کا احساس دلانا اور یہ راستہ دکھانا کہ کیسے اپنے حقوق حاصل کئے جائیں اور ان کا کس طرح استعمال کیا جائے۔ یہ سب انھوں نے سیکھا اور سکھایا۔

طالب علموں کے ساتھ ان کو خاص دلچسپی تھی۔ بچپن ہی سے تعلیم کے دلدادہ تھے۔ اسکول کی چھوٹی جماعت میں تھے، اسی وقت الہ آباد میں اپنے ماموں سے ایک کمرہ حاصل کرکے اس میں ایک کتب خانہ قائم کر دیا تھا۔ اخبار، رسالے اور بچوں کی معیاری کتابیں برابر لاتے رہتے۔ محلہ کے بچوں کو دعوت دی کہ آکر مطالعہ کیا کریں۔ یہ چھوٹا سا کتب خانہ بہت کامیاب رہا اور ان کے ہجرت کرنے کے بعد بہت دنوں تک قائم رہا۔ مگر اب کچھ عرصہ سے نگرانی نہ رہنے کی وجہ سے

بند ہو گیا۔ گھر کے تمام افراد کو، لڑکا ہو خواہ لڑکی، تعلیم کی ترغیب دیتے۔

پاکستان آئے ہوئے کچھ ہی عرصہ ہوا ہو گا کہ اختر میاں کے والدین اور بہنیں سب آ گئیں۔ زمینداری جو پشتوں سے ذریعہ معاش بھی، یہاں اس کا سوال ہی نہ تھا۔ گھر کا پورا بار ان کے اُوپر آ پڑا۔ مگر اس کو انھوں نے بڑی خندہ پیشانی سے اپنے کندھوں پر اُٹھا لیا۔ کبھی چہرے پر شکن نہ آئی۔ نہ وہ کبھی دل گرفتہ یا آزردہ ہوئے۔ گھر کی تمام ضروریات پوری کرتے۔ ان کی نظر بندی کے بعد گھر میں کافی پریشانی ہو گئی تھی مگر جیل ہی سے تاکید رکھتے کہ "بہنوں کی پڑھائی نہ بند کی جائے"۔ اپنے واپس آنے کے بعد انھوں نے بڑی محنت کی اور گھر کی تمام پریشانیاں دور کر دیں۔

ان کی تمام صفات کا گہرا اثر میرے بچوں پر بھی پڑا۔ ان ہی سے سب متاثر ہوتے رہے۔ جب بھی میں ان کے اوصاف پر غور کرتا ہوں تو مجھے بے اختیار اختر میاں یاد آ جاتے ہیں، میری آنکھیں ڈبڈبا آتی ہیں اور ایک خلش پیدا ہوتی ہے کہ وہ کچھ دن اور ہم لوگوں کے درمیان کیوں نہ رہے؟

اختر میاں اپنے بیشمار اخباری اور تنظیمی کاموں میں ایسے مشغول رہے کہ ان کو اپنا ہوش نہ تھا۔ نہ کھانے کا ٹھیک نہ آرام کا ٹھکانا۔ اسی جدوجہد میں ان کی زندگی کا یہ المناک اور آخری حادثہ پیش آیا جس نے کہ میرے اور ان کے، دونوں کے گھروں کو جڑوں سے ہلا دیا۔

وہ ۱۵ دسمبر ۵۸ء کو صبح حسب معمول اُٹھے۔ تیار ہوئے۔ کچھ عجلت میں تھے۔ ٹھیک سے ناشتہ بھی نہ کیا۔ سردی بہت سخت تھی مگر صرف گرم سوٹ پہن کر جانے لگے۔ والد صاحب نے سوئٹر پہننے کے لئے کہا بھی مگر وہ "ارے آبا سردی کہاں ہے" کہہ کر چلے گئے۔ تھوڑی دیر بعد ہی سے ان کو سردی سی لگنی شروع ہوئی اور جھرجھری سی محسوس ہوئی (دائرس کے جراثیم کا حملہ شروع ہو چکا تھا)۔ اس کی انہوں نے کچھ پرواہ نہ کی۔ اس روز وہ خاص طور پر بہت مصروف تھے۔ شام کو پریس کلب میں ٹیبل ٹینس کھیلی اور تقریباً گیارہ بجے رات کو گھر پہنچے۔ کپڑے تبدیل کئے، اپنے بلی کے بچے کو گدوں میں آرام سے کرسی پر لٹایا اور بغیر کھانا کھائے لیٹ رہے۔ اس وقت تک جراثیم نے پورا غلبہ پا لیا تھا۔ اور ان کا زہر تمام جسم میں پھیل چکا تھا۔ لحاف میں بھی سردی معلوم ہوئی۔ والدہ صاحبہ کو آواز دی، انہوں نے ایک اور لحاف اُڑھایا لیکن سردی کم نہ ہوئی۔ کہنے لگے "بھائی صاحب کو بلائیے"۔ والد صاحب نے مجھے

ٹیلیفون کیا، مگر بدقسمتی سے ٹیلیفون نیچے رکھا تھا اور ہم اوپر کی منزل پر سوئے ہوئے تھے، کچھ خبر ہی نہ ملی۔ آخر کار صبح تڑکے ہی والد صاحب میرے گھر آئے اور اختر کا حال سنایا۔ ان کی آپا تو بے چین ہو گئی تھیں، فوراً میرے ساتھ ہی ہو لیں۔

میں نے معائنہ کیا، بخار تھا، بے چینی تھی مگر پھیپھڑے صاف تھے۔ میں نے دوا دی انجکشن لگایا اور چلا آیا۔ دس بجے پھر گیا مگر ان کی حالت بدستور تھی۔ شام تک دوا اور انجکشن دیئے۔۔۔۔۔۔۔۔۔ رات کو دس بجے پھر دیکھا مگر کوئی افاقہ نہیں تھا۔ تنفس اس قدر بڑھ گیا تھا کہ صرف آگے جھک کر بیٹھنے میں ذرا سکون ملتا تھا۔ پھیپھڑوں میں اب تک کوئی علامت نہ ملی۔ زیادہ طاقت کی دوا دینا شروع کر دی۔ دل کی تقویت کے بھی انجکشن لگانے شروع کئے۔ مگر حالت پھر بھی نہ سدھری۔ تمام علامات وائرس نمونیا کے تھے۔ اور یہ مرض میرے خیال میں قطعاً مہلک ہوتا ہے۔ میں کچھ پریشان ہونے لگا۔ میرے تخیل میں ان کی بیماری انفلوئنزا کی وہ قسم تھی جس کا ۱۹۱۸ء میں عالمگیری دور کے بعد دور ہوا تھا۔ اس کا تفصیلی ذکر اکثر اخباروں میں آتا رہتا تھا۔ بخار زور سے چڑھنا، تنفس صدر درجے کا ہوتا اور آخر میں منہ اور ناک سے خون جاری ہونے کی وجہ سے موت واقع ہو جاتی تھی۔ یہ بھیانک شکل میرے سامنے آجاتی اور

میں اس کو ٹال دیتا کیونکہ میں اس تصوّر کی تاب نہ لا سکتا تھا۔

ان کے تنفس کو میں نے دل کی کمزوری کا سبب سمجھا اور دوسرے دن صبح جب حالت نہ سُدھری تو اسپتال منتقل کرنے کو سرور سے کہہ دیا۔ ایمبولنس کار لاکر وہ ۱۷ر تاریخ کی صبح جناح اسپتال کے ہارٹ کلینک میں داخل کروا دیئے گئے۔ دل کا ایکس رے لیا گیا۔ دوا اور انجکشن بدستور چلتے رہے۔ شام کو چار بجے میں ان کے پاس گیا۔ دیکھا تو ہوش اُڑ گئے۔ ان کی حالت غیر تھی۔ تنفس بے طرح تھا۔ چہرہ نیلا، آنکھیں سُرخ، بینائی قریب قریب ختم۔ آپا نے حالت پوچھی۔ میں نے کہا "کوئی اُمید نظر نہیں آتی"۔ بولے، "پھر گھر ہی لے چلو"۔ میں نے کہا۔ "اس کی تاب بھی نہ لائیں گے۔ کرنل سرور آرہے ہیں، دیکھ لیں، شاید کوئی سبیل نکل آئے"۔ مجھے بے اختیار اکبر کا شعر یاد آگیا۔ ؎

ہوتا نہیں طبیب مداوا سے دست کش
سچ ہے اجل تو ہنستی ہے بیٹھی طبیب پر

کرنل صاحب تشریف لائے۔ معائنہ کیا۔ پھیپھڑے صاف پائے۔ دل پر ورم تشخیص کیا۔ ایک نئی دوا لکھی اور کہا۔ "یہی ایک دوا باقی رہ گئی ہے۔ اگر اس نے کام کیا تو بچ جائیں گے ورنہ کوئی اُمید نہیں"۔ دوا دی گئی حالت سُدھرنے لگی۔ تنفس کم ہوا۔ ہوش میں آئے۔ لوگوں کو پہچاننے

لگے۔ سب کو اطمینان ہو چلا۔ ان کی آپا بھی کچھ مطمئن ہو کر گھر آ گئیں۔ میں دل میں سوچتا رہا کہ یہ تو جادو ہو گیا۔ اچھا ہی ہوا جو میں نے ان کو ہسپتال روانہ کرا دیا تھا۔ لیکن رات میں وہ اُٹھ کر غسل خانہ چلے گئے جو کہ وہاں سے خاصا دور تھا۔

اتنی تکان ان کے لئے بہت مضر ثابت ہوئی۔ دل کی دھڑکن میں اضافہ ہو گیا۔ تنفس کی کیفیت عود کر آئی۔ حالت پھر گرنے لگی۔ اسی اثنا میں پرائیویٹ وارڈ میں جگہ مل گئی۔ کرنل سرور، ڈاکٹر قاسم اور تمام ڈاکٹروں نے دیکھا۔ طرح طرح کی تشخیص ہوتی رہیں۔ شام کو جب پھیپھڑے کا ایکسرے ہوا تو معلوم ہوا کہ دونوں پھیپھڑے منجمد ہیں۔ وائرس نمونیا ہی کا کیس ہے۔ حالت نازک ہے۔ اب تو دوا اور انجکشن کی بھرمار ہو گئی۔ اس مرض میں کوئی دوا کام نہیں کرتی۔ صرف اکرومائی سین کبھی کبھی کام کر جاتی ہے۔ اس کو میں نے ۱۷ تاریخ کی شام کو کافی مقدار میں دینا شروع کر دیا تھا۔ مگر بدقسمتی سے جب اختر اسپتال میں داخل ہوئے تو وہ روک دی گئی تھی۔ دوسری دواؤں کے دینے سے خلاف توقع اور نمایاں فائدہ ہوا تو پھر اس کے جاری رکھنے کی ضرورت نہیں سمجھی گئی۔ اب یہی اکرومائی سین ان کی رگوں میں پانی کی طرح بہا دی گئی۔ مگر ان کی وہ حالت بدستور قائم رہی۔ ۱۹ تاریخ کی صبح کو بلغم میں خون آنا شروع ہوا جو مسلسل تھوڑا

تھوڑا آتا رہا۔

۲۰ر تاریخ کی صبح تیار ہوا اور یہ خیال کیا کہ بچے اسکول کالج جا رہے ہیں۔ ان کو چھوڑ کر کار واپس آجائے تو میں اسپتال جاؤں۔ رات میں بارش ہوئی تھی۔ اب بھی پھوار پڑ رہی تھی۔ مگر یکایک میرے دل میں کچھ بے چینی پیدا ہوئی اور میں نے گاڑی روک لی اور بچوں کے ساتھ ہی چل دیا۔ ان کو کالج چھوڑ کر اسپتال پہنچا۔ تیز قدم سے ان کے کمرے میں داخل ہوا تو ان کی شکل دیکھ کر میرا دل بیٹھنے لگا۔

وہ اٹھنا چاہتے تھے۔ دونوں کہنیاں ٹیک دیں۔ میں نے سہارا دے کر لٹا دیا۔ اختر نے ایک آخری لمبی سانس لی اور ہمیشہ کیلئے آسودگان خاک میں شامل ہونے کے لئے روانہ ہو گئے۔

ان کی والدہ اور آپا وغیرہ بے اختیار ہو گئیں۔ کہرام مچ گیا۔ ان کے مرض کے مہلک ہونے کی خبر اب تک ان لوگوں سے پوشیدہ رکھی گئی تھی۔ جھوٹی اُمیدوں کو سچا سمجھ کر یہ تمام ڈاکٹر اپنی پوری سعی علاج میں مصروف تھے اور یہ سوچ بھی نہ سکتے تھے کہ ایسا تندرست، قد آور جوان موت کی آغوش میں یک بیک یوں چلا جائے گا اور ہم دیکھتے کے دیکھتے رہ جائیں گے۔ مگر ہوا یہی۔ سچ ہے قسمت کے لکھے کو کون مٹا سکتا ہے۔

بارش کبھی زور پکڑ جاتی اور کبھی رُک جاتی۔ گویا آسمان جیسا جفاکار بھی اس ناگہانی، قبل از وقت جوان موت پر رہ رہ کر رو رہا تھا۔ اور اپنے کیے پر پشیمان ہو رہا تھا۔

تمام دن بارش ہوتی رہی۔ جنازے کی نماز بھی بارش میں پڑھی گئی۔ سب لوگ بھیگتے ہی قبرستان تک ان کو لے کر گئے اور آغوشِ لحد میں سُلا کر چلے آئے۔ اس طرح دھرتی ماتا نے اپنے ایک نوجوان بہادر ہونہار، اور قابل سپُوت کو اپنی آغوش میں لے لیا۔

اختر کو تو سپردِ خاک کر کے چلے آئے مگر اکیلے نہ آ پائے۔ اختر کی یاد ساتھ ساتھ آئی۔ جو گھر کے ہر فرد کے دل و دماغ میں ہر وقت موجود رہتی ہے۔ ان کا مسکراتا ہوا چہرہ نظر سے نہیں ہٹتا۔ ان کی گمبھیر آواز اور ان کے گونجتے ہوئے قہقہے اکثر سنائی پڑتے ہیں اور فوراً ہی فضا میں گھل کر غائب ہو جاتے ہیں۔ آج سال بھر ہونے کو آیا مگر ان کی یاد اسی طرح تازہ ہے اور ہمیشہ تازہ رہے گی کیونکہ اختر تو ان لوگوں میں سے تھے جو دلوں میں جگہ پاتے ہیں اور وہیں ہمیشہ زندہ رہتے ہیں۔

سعیدہ حلیم

بڑے بھائی

بڑے بھائی کی زندگی ایک کھیل کی طرح شروع ہوئی، کھیل کی طرح جاری رہی اور پھر اس کھیل کا خاتمہ بھی ہوگیا کسے معلوم تھا کہ کھلاڑی جس آن بان سے میدان میں آیا ہے اسی آن بان سے بغیر کسی تھکن اور اُکتاہٹ کے رخصت بھی ہو جائے گا۔

الہ آباد میں مجموعی طور پر مسلمان زمیندار خاصی تعداد میں موجود تھے۔ جاگیردارانہ نظام کو سینے سے لگائے یہ تمام خاندان اپنی روایات اور اپنی رواداری کو برتتے جا رہے تھے۔ خاندانی رتبے اور خاندانی رسوم و روایات کو دم توڑتا ہوا یہ زمیندارانہ نظام بھی ختم کرنے میں ناکام تھا۔ خاطر تواضع، رکھ رکھاؤ اور بزرگوں کی باتوں پر ایمان رکھے چند خاندان نئی قدروں کے خلاف پرانی روایات کی پاڑھ باندھ رہے تھے لیکن

بھلا اُمنڈتے ہوئے سیلاب کو کانٹے کے چند تار کہاں تک روک سکتے ہیں؟ ..... ان خاندانوں میں دو خاندان اپنی رواداری و بزرگی کو بڑی مضبوطی سے تھامے کھڑے تھے ہمارے دادا اور نانا بڑے رکھ رکھاؤ اور زوردار قسم کے آدمی تھے ان کی سی صفات صرف قدیم لوگوں تک ہی محدود تھیں رسوم و روایات خاطر تواضع اور مروت محبت ان کی زندگی کی ساتھی تھیں۔ دادا کی بہت ساری اولادوں میں سے صرف تین بیٹے زندہ بچے اور ان میں سب سے چھوٹے میرے والد تھے۔ گھر والوں کے لاڈ پیار اور پرانی رسموں کے مطابق ابا کی شادی وہ ابھی علیگڈھ یونیورسٹی میں ایف۔اے کے دوسرے سال ہی میں تھے کہ کر دی گئی۔۔ ہماری اماں الہ آباد کے چوٹی کے زمیندار گھرانے سے بیاہ کر آئی تھیں خاندان میں سب سے چھوٹی بے حد خوبصورت اور بڑی لاڈلی۔

اور ۱۱ ستمبر ۱۹۲۸ء کو اس خاندان میں بھائی پیدا ہوئے۔ بھائی سے پہلے دو لڑکے ایک ایک سال کے ہو کر مر چکے تھے اس لئے بے حد منتوں اور مراد کے درمیان پیدا ہوئے اور محرم کی دسویں کو فقیر بنائے گئے۔ بارہ سال کی عمر میں اماں انھیں اجمیر شریف، خواجہ صاحب کے عرس میں لے گئیں۔ بھائی کی پیدائش ہی کچھ اس دھوم دھام سے ہوئی کہ دیکھنے والوں نے ان کی غیر معمولی شخصیت کو بچپن سے ہی تسلیم کر لیا۔ پیدا ہونے

کے چوبیس گھنٹے بعد بچپن میں ایسی سخت سخت بیماریاں پائیں کہ حکیم ڈاکٹر سب جواب دے جاتے پر نہ جانے وہ کونسی دعائیں تھیں جو آسمان کے بھی سخت سینے میں شگاف کر دیتیں اور بھائی موت کے منہ سے بچ جاتے۔ شاید اسی لئے کہ جوانی میں انھیں ماں باپ کو یہ صدمہ دکھانا تھا۔ ان کی ہولناک بیماریوں سے سب اتنے بولائے رہتے کہ معمولی نزلہ زکام میں بھی دو دو ڈاکٹر نبض پکڑ کر بیٹھ جاتے۔

نانا اور ماموں بھائی پر جان چھڑکتے تھے ایسا لگتا جیسے نواسے اور بھانجے کو پاکر انھیں دنیا کی سب سے انمول دولت مل گئی ہے یوں بھی ہم سب بہن بھائی اپنے ننھیال میں ہی زیادہ تر پلے بڑھے اور وہیں کا اثر لیا۔ قدرتی بات تھی کہ بھائی میں بھی یہ اثر آتا۔ ان میں نانا کی رواداری، مروت و محبت، روایات کا بے پناہ احترام اور خاطر تواضع کوٹ کوٹ کر بھری گئی تھی۔ سیاست ہمارے ماموں کا مشغلہ تھی عمر کا زیادہ حصہ الیکشن لڑنے اور جیتنے میں صرف کیا۔ بھائی کو بھی بچپن سے ہی سیاست سے ایسا لگاؤ پیدا ہوا کہ وہ ان کے ذہن میں رچ بس گئی۔

ہماری آماں یوں تو خیر سبھی بچوں پر جان چھڑکتی تھیں لیکن نہ جانے وہ کونسی صفات تھیں جن کی بنا پر بھائی سے ان کی محبت عشق کے انتہائی درجہ پر پہنچی ہوئی تھی۔ ان کے انتہائی معمولی اور ادنیٰ سے کاموں میں بھی

وہ تاخیر نہ برتتیں۔ ابا کو رات کو اس وقت تک کبھی نیند نہ آتی جب تک وہ اُٹھ کر خود بھائی کے لئے دروازہ نہ کھولتے۔ نانی، خالہ اور اماں بھائی پر بالکل پروانہ وار نثار تھیں اور ہر دم ہائے چھاپہ کرتی رہتیں۔ بیمار پڑتے تو اُن کی تکیہ کے نیچے پیسوں کے ڈھیر لگا دیتیں جنہیں وہ بڑی فراخدلی سے گھر میں آئے گئے چمار پاسیوں کے بچوں میں تقسیم کر دیتے۔

اتنے لاڈ پیار کے بعد اگر کوئی بگڑ جائے یا مغرور ہو جائے تو کچھ تعجب کی بات نہیں۔ یوں بھی زمیندار گھرانوں کے بچے حکومت اور ملکیت کے احساس تلے پرورش پا کر خود کو بڑا حاکم اور مالک سمجھنے لگتے ہیں۔ لیکن بھائی میں اس قسم کا کوئی احساس نہ تھا وہ بچپن سے ہی ذہین تھے غیر معمولی طور پر لوگ ان کا رعب اور دبدبہ مانتے تھے شکل و صورت اور جسامت میں اپنے تمام ساتھیوں سے اور خاندان کے تمام لڑکوں میں غیر معمولی طور پر خوبصورت تھے لیکن ان سب باتوں کے باوجود بھائی میں اتنی سادگی اور اتنی انکساری تھی کہ آج تک بہت کم لوگوں میں نظر آئی ہے۔

بچپن سے ہی اپنی ذہانت اور تیزی کی وجہ سے اپنے ساتھیوں پر چھائے رہے پڑھنے لکھنے کا بے انتہا شوق تھا۔ اپنا تمام جیب خرچہ کتابیں خریدنے میں صرف کر دیتے۔ انھیں چھوٹی سی عمر سے ہی اس بات کا بڑا احساس تھا کہ ہمارے ملک سے جہالت اور دوسری خرافات دور ہوں اسکول سے

واپس آکر شام کے وقت محلے کے تمام غریب بچوں کو جمع کر لیتے اور پڑھانا شروع کر دیتے۔ پھر گھر کے ہی دو کمروں میں ایک لائبریری بنا ڈالی اور ڈھونڈ ڈھانڈ کے بڑی عمدہ کتابیں جمع کیں تین چار رسالے اور اخبار لائبریری کے نام پر جاری کرائے اور یہ سب کچھ اپنے خرچ پر کیا کسی سے ایک دھیلا بھی کبھی چندے کے طور پر نہ لیا۔ بھلا قوم کی خدمت میں بھی کوئی معاوضہ لیا کرتا ہے؟۔ لوگ صبح ہی صبح لائبریری میں آکر بیٹھ جاتے اور پڑھا کرتے۔

خاندان کی تمام لڑکیوں میں سب سے پہلے پڑھنے لکھنے کا شوق پیدا کیا۔ میرے اور بی بی کے لئے بچوں کے عمدہ عمدہ رسالے منگاتے۔ آپا کو تو کورس پڑھنے سے ہی فرصت نہ تھی لیکن بجیا کے لئے ڈھونڈ ڈھونڈ کر کتابیں لاتے تھے۔

بھائی اگر ہمارے گھر میں یہ کہا جائے کہ پیار اور محبت کا مرکز تھے تو غلط نہ ہوگا۔ ماں باپ تو انھیں جتنا عزیز رکھتے تھے اس کے متعلق کچھ کہنا ہی بیکار ہے لیکن ہم سب بہن بھائی بھی ان پر جان دیتے تھے۔ آپا جان میں اور بھائی میں سات برس کا فرق تھا۔ وہ آپا کا بے حد احترام کرتے ان کے سامنے کبھی سگریٹ نہ پیتے اور ادھر آکر کبھی کبھار پینے بھی لگے تو ہمیشہ پوچھ کر پیتے۔ ان کی ہر بات کو فوراً مان لیتے اور خود آپا جان

کا رویّہ ان سے ماؤں جیسی شفقت اور محبت کا تھا۔ چھوٹے بھائی سے ان کا اُوپر تلے کا معاملہ تھا دونوں میں لڑائی بھی خوب ہوتی اور چھنتی بھی بہت تھی۔ میں اور بی بی اُن سے بہت چھوٹے تھے اور وہ ہم سے بچوں والا سلوک کرتے اور بجیا اور آپا کو چھوٹی بہنوں کی طرح چاہتے تھے۔

بچپن سے ہی بھائی بڑے بہادر تھے وہ ان لوگوں میں سے تھے جن کا ضمیر ہمیشہ صاف رہتا ہے اور وہ سب کچھ اپنے ضمیر کی آواز پر کرتے ہیں۔ بھائی کے اسکول کالج کے قصّے اکثر اماں ہم لوگوں کو سُناتی ہیں۔ یہ اس زمانے کا واقعہ ہے جب بھائی ساتویں جماعت میں تھے۔ چھوٹے بھائی (ڈاکٹر سرور) ان سے ایک کلاس پیچھے تھے۔ اور حد درجہ شیطان اور ضدی قسم کے واقع ہوئے تھے۔ نہ جانے کیا بات ہوئی کہ ان کے کلاس ماسٹر نے انھیں بغیر کسی وجہ کے دھڑا دھڑ مارنا شروع کر دیا۔ بھائی اس وقت کسی کام سے باہر گئے تھے۔ اُن کی نظر جُوں ہی چھوٹے بھائی پر پڑی نہ آؤ دیکھا نہ تاؤ جھٹ کلاس میں بغیر اجازت لئے گھس گئے اور تیزی سے چھوٹے بھائی کو پکڑ کر گھسیٹتے ہوئے باہر لے آئے۔ اس چھوٹی سی بات سے پتہ لگتا ہے کہ بھائی بچپن سے ہی کس قدر دلیر تھے۔ ان کی اخلاقی جرأت کتنی بلند تھی اور وہ اپنے بھائی بہنوں کو کتنا چاہتے تھے۔ اسکولوں میں ماسٹروں کی حیثیت کچھ ناخداؤں کی سی ہوتی

ہے لیکن بھائی نے کوئی پروانہ کی کیونکہ انھیں معلوم تھا کہ جھوٹے بھائی بے قصور ہیں۔

بچپن سے ہی بھائی کو کھیل کود سے بے حد لگاؤ تھا ہم لوگوں کی ساری گڑیاں صندوق سے نکل نکل کر ہاکی کی گیندیں بن جاتیں گھر کے تمام تکیے ایک دوسرے کی نشانہ بازی کرتے کرتے اُدھڑ جاتے۔ بیچاری اماں کی انگلیوں میں نئے نئے پاجاموں اور قمیضوں کو سیتے رفو کرتے کرتے سوراخ ہو جاتے۔ اپنے اسکول کالج اور یونیورسٹی میں ہمیشہ چمپئن شپ حاصل کی اور آل انڈیا ٹورنامنٹس میں منتخب ہوتے رہے

بھائی ابھی پندرہ سولہ برس کے ہی تھے کہ ان کی شادی کے چرچے ہونے لگے۔ بی۔ اے کے بعد تو لوگ اپنی اپنی لڑکیوں کے لئے خود ہی اُمیدوار بن گئے۔ خوبصورتی تھی، تندرستی تھی، روپیہ پیسہ تھا۔ عادات اور اخلاق پر لوگ جان دیتے تھے اور پھر مستقبل بہت شاندار اور روشن تھا بھلا لوگ کیوں نہ گھیرتے۔ ماں اور نانی کی خواہش تھی کہ دلہن قریبی عزیزوں میں سے ہو۔ بہنوں کی آرزو تھی کہ بھابی اُن کے بھائی جیسی خوبصورت اور پڑھی لکھی ہو۔ لیکن بھائی کا خیال کسی کو نہ معلوم تھا وہ پانچ چھ سال تک شادی کا کوئی ارادہ نہ رکھتے تھے۔ چنانچہ سب کے ارادوں اور آرزوؤں پر اوس پڑ گئی۔

ایم اے میں آکر کایا ہی پلٹ گئی۔ طالب علموں کی سیاست میں کچھ ایسے اُلجھے کہ سب دیکھتے ہی رہ گئے۔ یونیورسٹی کی ہر تحریک میں آگے آگے رہے — مجھے ٹھیک سے یاد نہیں پڑتا پر نہ جانے کیوں آلہ آباد یونیورسٹی کے طلبا نے اسٹرائیک کر دی۔ یونیورسٹی ہمارے گھر کے بالکل سامنے تھی۔ طالب علم جوش میں بھرے بڑے زور شور سے اپنے حقوق کے لئے لڑ رہے تھے اور سرسپرو کی لڑکی اپنی گاڑی سے اُتر کر کلاس میں جانے لگی۔ بھائی اور ان کے ساتھی گیٹ پر ہی کھڑے تھے۔ وہ مصر تھی کہ کلاس میں جائے گی۔ بھائی اور ان کے ساتھی پہلے تو اسے سمجھانے لگے پر جب وہ نہ مانی تو بھائی گیٹ پر لمبے لمبے لیٹ گئے اور اس سے کہا کہ اگر تم میرے اُوپر سے جا سکتی ہو تو شوق سے جاؤ بھائی کی شخصیت کا رعب و اثر اور کچھ اس کے اپنے ضمیر کی آواز بیچاری اُلٹے پاؤں لوٹ گئی۔

یوں تو بھائی زندگی میں ہمیشہ ہی بہت سرگرم رہے پر ایم۔اے میں آکر تو انہیں اپنی سدھ بدھ ہی نہ تھی۔ سارا سارا دن غائب رہتے۔ یوں بھی ان دنوں تحریک آزادی اپنے شباب پر تھی اور بھائی اپنی جماعت کے انتہائی پرجوش پر اثر اور دلیر قسم کے کارکنوں میں سے تھے۔ ۱۹۴۹ء میں بھائی کراچی آگئے۔ آ کیا گئے زبردستی لائے گئے۔

حالات ہی کچھ اتنے نازک ہو گئے تھے .....

..... آپا جان انھیں زبردستی اپنے ساتھ گھسیٹ لائیں بہانہ یہ بنایا کہ بھائی انھیں چھوڑ کر واپس چلے جائیں گے لیکن یہاں آکر ایسے پھنسے کہ پھر انھیں ہندوستان جانا نصیب نہ ہوا۔

شروع شروع کا معاملہ تھا اور کراچی میں اچھی اچھی نوکریاں بڑی آسانی سے ملتی تھیں لیکن بھائی نے اپنی پسند کو مقدم رکھا اور صحافت سے جو انھیں فطری لگاؤ تھا اسی کو اپنا لیا۔

اس کے ایک سال بعد ہی ہم لوگ کراچی آ گئے اور بھائی پر اتنا بار پڑا کہ پھر انھیں سر اٹھانے کی مہلت نہ ملی ـــــ لیکن کتنی عجیب بات تھی کہ اتنی بہت سی ذمہ داریوں کے باوجود وہ اپنی باہر کی زندگی میں ہمیشہ سب سے نمایاں اور اعلیٰ رہے۔ ایک طرف تو انھوں نے گھر کی ذمہ داریوں کو یوں نبھایا کہ دنیا میں ایک مثال قائم کر دی۔ ایک بھائی اور ایک بیٹے کے وہ فرائض ادا کئے جن کے متعلق لوگ سوچتے بھی نہیں اور دوسری طرف انھوں نے صحافیوں کے حقوق اور ذمہ داریوں کو ایسا نبھایا کہ اب کبھی ان کی جگہ کوئی پوری نہیں کر سکتا اور نہ کوئی اتنی خوبیوں کا مالک ہو سکتا ہے۔ جیل سے بھائی جو خط لکھتے اس کے ایک ایک لفظ سے پتہ چلتا کہ انہیں گھر کی کس قدر فکر ہے۔ اپنی اسیری سے زیادہ انہیں یہ خیال کر کے

بے چینی تھی کہ ان کی بہنیں اور ان کے ماں باپ کس حال میں ہوں گے لیکن انہوں نے کبھی اپنی کوئی پریشانی ہم لوگوں پر ظاہر نہ کی۔ وہ یہ بھی بڑی اچھی طرح جانتے تھے کہ ان کے پیچھے ان کا خاندان اس طرح موجود ہے کہ ان کی آڑ لے کر وہ ہر بات کا مقابلہ کر سکتا ہے۔ کٹھن سے کٹھن موقعوں پر بھی ہم لوگ بھائی کے سہارے مقابلے کی قوتوں کو سمیٹتے رہے

جنوری ۵۳ء کے واقعہ سے اور یوں بھی اس زمانے میں چھوٹے بھائی کی مصروفیتوں اور کام کاج سے سارا گھر پریشان تھا اور سب بیحد فکرمند تھے لیکن یہ بڑے بھائی کی ہی شخصیت تھی کہ ایک طرف تو انہوں نے گھر والوں کو تسلی دی اور سب کی ہمت بڑھاتے رہے اور دوسری طرف چھوٹے بھائی کے لئے ایک چٹان بن کر کھڑے رہے۔ ہر بات اپنے اوپر لے کر انہیں کام کی مختلف راہیں دکھاتے رہے اور ان کو سہارا دیتے رہے۔ اور یہ انہیں کی شخصیت تھی جس کے بل بوتے پر چھوٹے بھائی ہر کام بغیر کسی خوف و جھجھک کے کر ڈالتے۔ دراصل بھائی ہم سب کے لئے ایک ایسے چھتنار درخت تھے جس کے سائے میں ہم سب گرمی، دھوپ اور بارش سے محفوظ بیٹھے رہتے۔ لیکن آج اس وسیع درخت کی گھنی چھاؤں کے چھٹنے کے بعد یوں محسوس ہوتا ہے کہ ہم سب دھوپ کی تیز تپش اور ہواؤں کے بہنگم جھونکوں میں چٹیل میدان میں کھڑے

ہیں۔ اور وہ اُونچا اور مضبوط پہاڑ ذرّے ذرّے ہو کر بکھر گیا ہے جس کے دامن میں ہم نے مسرّت، زندگی اور مستقبل کے نہ جانے کتنے باغ لگائے تھے۔ اور گالوں پر ہاتھ رکھے پہاڑ سے بہتے ہوئے اس چشمے کو تکا کرتے جس کا گنگناتا پانی باغ کے پودوں کو سیراب کرتا ہوا بہتا رہتا۔ ..... اب سے ایک سال پہلے کی زندگی کچھ یوں محسوس ہوتی ہے کہ بقول درد ؎ "خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا جو سُنا افسانہ تھا"

آماں کے ہاتھ کے پکّے ہوئے وہ لذیذ کھانے، جن میں وہ لذت اب کبھی نہیں ہو سکتی، دوستوں اور بھائیوں کے وہ فلک شگاف قہقہے قدم قدم پر پُر لطف دعوتیں اور زندگی کی ہماہمی، یہ سب کچھ ماضی کی ایک ایسی کہانی معلوم ہوتی ہے جس پر کوئی نیا ورق کبھی بھی چسپاں نہیں کیا جا سکتا۔

بھائی کو کھانے اور کھلانے دونوں چیزوں کا بڑا شوق تھا۔ اگر ایک ہفتہ بھی گزر جاتا اور گھر میں کوئی میٹھی ڈش نہ پکتی تو بھائی فوراً فرمائش کر بیٹھتے۔ دعوتوں کا بڑا شوق تھا یوں بھی بچپن سے ان کی یہ خاص عادت رہی کہ اپنے دوستوں کو بغیر اطلاع کے گھر میں عین کھانے کے وقت لے آتے اور بے چاری آماں جلدی جلدی سب کے لئے اہتمام کیا کرتیں۔ یہی عادت ان کی ہمیشہ قائم رہی۔ کوئی بھی آجاتا بغیر کھانے ناشتے کے اُسے

نہ جانے دیتے ہم لوگ بھائی کی اس بے جا خاطر مدارات سے تنگ آجاتے تو بڑے فخر سے گردن اُونچی کر کے کہتے ـــــ "آپ کو معلوم ہے میں کس خاندان سے تعلق رکھتا ہوں۔ ہمارے نانا اور دادا رات کی ٹرین کا وقت دیکھ کر کھانا کھاتے تھے"۔

فراخ دلی بچپن سے ہی کوٹ کوٹ کر بھری تھی۔ ہر کسی کی ضرورت بغیر جھجک کے پوری کر دیتے۔ بھائی کے پاس دوستوں کے علاوہ اور بھی لوگ اپنی ضرورتیں لے کر آجاتے۔ شاید یہ ان کی طبیعت کی سادگی اور بے تکلفی تھی کہ لوگ اپنی ضرورت کا اظہار کرنے میں ذرا بھی نہ جھجکتے۔ آپا جان اکثر بڑے مزے کے لہجے میں کہتیں۔ "اختر کی تو وہی مثال ہے آپ میاں مانگتے دروازے کھڑا درویش" ـــ یہ سُن کر بھائی ہنس دیتے اور بات ختم ہو جاتی۔

اکثر رات کو جس دن جلدی آجاتے کپڑے بدل کے منہ ہاتھ دھو کر اماں کے پاس آکر لیٹ جاتے اور پھر دُنیا جہان کی باتیں کرتے رہتے۔ خاندان کے ایک ایک فرد کے متعلق باتیں کرتے۔ اپنے بچپن کے دوستوں کو یاد کرتے اور کُنبے برادری کے دُور دُور کے لوگوں کو پوچھا کرتے اپنے بچپن کا تذکرہ اماں سے بڑے شوق سے سُنا کرتے اور کسی ایسی ویسی بات پر ایک زبردست فرمائشی قہقہہ بلند کرتے۔ انھیں الہ آباد سے اور خصوصاً

اپنے آبائی گاؤں سے بڑا پیار تھا۔

طبیعت میں اس قدر رواداری اور مروّت تھی کہ کوئی شخص کتنا ہی بور کرے بڑی خندہ پیشانی سے ملتے، بھائی گھر میں کبھی پتلون قمیص نہ پہنتے، باہر سے آنے کے بعد فوراً اپنے کمرے میں جاکر کپڑے بدلتے۔ گرمیوں کے دن ہوتے تو نہاتے اور سردیوں میں منہ ہاتھ دھوکر آرام سے بیٹھ جاتے اور پھر کھانا کھاتے۔ کبھی کسی کی دعوت ہو یا کچھ ہو ان کے پروگرام میں فرق نہ آتا۔ بھائی کو خاندان اور روایات کا بڑا احساس تھا وہ انہیں خواہ مخواہ توڑنا پسند نہ کرتے تھے۔ انھیں بیکار کے فیشن اور خامخواہ کی بناوٹ سے بڑی چڑ تھی۔

بھائی کی یہ زبردست خواہش تھی کہ ان کی بہنیں اور بھانجیاں زندگی میں کچھ کام کریں۔ وہ چاہتے تھے کہ اور لڑکیوں سے مختلف ہو کر ہم اپنے ملک اور اپنی قوم کے لئے کچھ کریں اسی غرض کے لئے انھوں نے بجیا کو زبردستی لاہور بھیجا تاکہ وہ سوشل ورک میں ایم۔ اے کرکے کچھ کریں۔ وہ اپنے گھر کی لڑکیوں کو سادہ اور سرگرم دیکھنا پسند کرتے تھے۔ ان کی خواہش کے مطابق سادگی تو قائم رہی لیکن ہم میں سے کسی نے کبھی کوئی کام کرنے کی کوشش نہ کی۔ آخر میں آکر انہیں بڑی مایوسی ہوگئی تھی۔ اکثر آپا جان سے بڑے شکایت آمیز لہجے میں کہتے "بھئی آپا ان

لڑکیوں نے تو پڑھ لکھ کر ہی گھاس کھودی ہے"۔ خاندان کے بچے بچے پر نظر رکھتے۔ عذرا ارشد (آپا کے بچے) کی انھیں خاصی فکر رہتی۔ ان کی بڑی خواہش تھی کہ عذرا ہم لوگوں کے ساتھ رہ کر کچھ سیکھ لے۔ لیکن جب اس کا دل یہاں نہ لگتا تو بہت چڑھتے۔

بھائی کی طبیعت میں صفائی اور نفاست بہت زیادہ تھی۔ اوّل تو ہم لوگ گھر خود ہی صاف رکھتے لیکن اگر کبھی کوئی بے ترتیبی اور گندگی ہوجاتی تو بھائی فوراً ٹوک دیتے۔ اپنے لمبے قد کی وجہ سے اکثر گھر کے گلوب اور بلب اتوار کو صاف کیا کرتے۔ ایک دن اتوار کی شام کو ہم لوگ کہیں چلے گئے ان دنوں شہر میں مکھیاں بہت ہوگئی تھیں۔ واپس آکر دیکھتے ہیں تو بھائی فلٹ کی پچکاری لئے سارے گھر میں گھوم رہے ہیں اور سب کمروں سے مکھیاں نکال رہے ہیں۔

بھائی شادی سے یوں بھی ہمیشہ کتراتے رہے۔ دوسرے کراچی آکر انھیں اپنی ذمہ داریوں کا اتنا شدید احساس ہوگیا تھا کہ جب کبھی آپا جان ان کی شادی کا تذکرہ کرتیں ٹال جاتے۔ وہ ہمیشہ کہا کرتے تھے کہ "ہمارے حالات اس قابل نہیں ہیں کہ ہم شادی رچا کر بیٹھیں" بھائی نے زندگی میں صرف ایک بار محبت کی اور اتنی شدت سے کہ مثال قائم کردی دونوں ایک دوسرے کو بہت پسند کرتے تھے۔ گھر والوں کی بھی

خواہش تھی کہ دونوں کی شادی ہوجانی چاہیئے لیکن تقسیم ہندوستان نے حالات اتنے پیچیدہ کر دیئے کہ پھر بات آگے نہ بڑھ سکی اور دونوں کے ارمان دل کے دل ہی میں رہ گئے۔

جب کبھی آپا کہتیں کہ "اختر تم کوئی لڑکی ڈھونڈھ لو آخر اتنے سوشل ہو کسی کو پسند کیوں نہیں کر لیتے؟" تو وہ ہمیشہ بڑی سنجیدگی سے کہا کرتے "بھئی آپا میں نے تو ایک دفعہ ایک لڑکی پسند کر لی اور وہی مجھے پسند ہے اب اگر آپ میری شادی کرنا چاہتی ہیں تو اپنی پسند سے کریئے" — آپا جان نے نہ جانے کتنی لڑکیاں دیکھ ڈالیں۔ لیکن انھیں اپنے بھائی کی ٹکر کی کوئی لڑکی نظر نہ آئی۔ دراصل بھائی جیسے کردار اور شخصیت کے لئے جو لڑکیاں موزوں ہوتی ہیں وہ ہزاروں میں ایک آدھ ہی ہوتی ہیں اور وہ ہزاروں میں ایک بھی کہیں نظر نہ آئی۔ پھر بھی ہم لوگوں کی تلاش جاری رہی۔ آپا اور شیریں گیتی ہر نیا کپڑا ماموں اور بھائی کی شادی کے لئے اُٹھا رکھتیں۔ بھیّا[1] اپنے ہر خط میں ایک پیاری سی ممانی کا پرزور مطالبہ کیا کرتے۔ ہم لوگ ہر لڑکی پر پاس کرنے کے بعد اماں سے کئی کئی جوڑوں کی فرمائشیں کر ڈالتے اور نیگ کی رقم مقرر کرنے لگتے — اور ان بہت سے ارمانوں کے درمیان جب ایک جگہ بات چیت تقریباً طے ہوگئی۔ سب کے جوڑوں کے حساب لگنے

[1] ڈاکٹر اقبال وحید، مقیم لندن)

لگے، زوردار قسم کی دعوت کے تذکرے ہونے لگے اور ہم لوگوں کی بے چینی تو اس حد تک بڑھی کہ بھائی کی شادی پر دعوت دینے کے لئے لوگوں کی فہرست تک بنانے لگے تو پتہ چلا کہ بیس دسمبر آگئی ہے۔ وہ منحوس تاریخ جس دن لوگ ان کی شادی کی مبارکباد دینے نہ آئے بلکہ ان کے جنازہ میں شرکت کرنے آئے ـــــ سب کے ارمان دل کے دل میں ہی گھٹ گئے۔ دنیا سے ایک ایسا شخص اُٹھ گیا جسے ابھی زندگی میں بہت کچھ کرنے کی تمنا تھی جو بہت کچھ کر سکتا تھا اور کرتا تھا، جسے زندگی سے والہانہ پیار تھا۔ جو موسم کی خوبصورتی اور صاف شفاف چاندنی کی خنکی پر مرمٹتا تھا۔ جو اپنے سے زیادہ دوسروں کے لئے زندہ رہنا چاہتا تھا۔ جس نے ساری زندگی دوسروں کے لئے وقف کر دی تھی وہ زندگی کے ہر عیش و ہر آرام کو چھوڑ کر ہمیشہ کے لئے اس سے منہ موڑ کر چلا گیا..... پھر بھی نہ جانے کیوں یقین سا نہیں آتا۔ ایسا لگتا ہے جیسے سب کچھ خواب تھا ابھی آنکھ کھل جائے گی تو یہ سب کچھ بھی نہ ہوگا۔ بھائی گھر کے کسی کونہ سے مسکراتے ہوئے نمودار ہو جائیں گے..... رات کے سناٹے میں جوں ہی کسی موٹر رکشا کی آواز سنائی دیتی ہے ہم سب چونک پڑتے ہیں اور گردنیں اُٹھا اُٹھا کر باہر دیکھنے لگتے ہیں مجھے یوں محسوس ہوتا ہے کہ کوئی اپنے مخصوص انداز میں بھاری بھاری قدم رکھتا پھاٹک میں نمودار ہو جائے

گا۔ اور ہولے ہولے دروازہ کھٹکھٹائے گا۔ ابا اُٹھ کر آہستہ سے چٹخنی کھول دیں گے اور وہ آہستہ آہستہ قدم رکھتے اپنے کمرے کی بتی کھول کر کپڑے بدلنے لگیں گے ..... کہیں کوئی جاگ نہ جائے۔ اس خیال سے آہستہ آہستہ منہ ہاتھ دھوئیں گے۔ پھر بھی اماں ان سے پہلے کھانے کی میز پر موجود ہوں گی ..... میں چونک کر باہر دیکھتی ہوں اندھیرے کی سیاہ چادر باہر پھیلی رہتی ہے، رات کے سناٹے کو چیرتی ہوئی موٹر رکشا کی آواز بہت دیر ہوئی رات کی تاریکی میں ڈوب گئی ہے۔ اور اس پھاٹک میں اب کبھی کوئی بھاری بھاری قدم رکھتا اپنے مخصوص انداز سے ہولے ہولے دروازہ کھٹکھٹانے نہیں آئے گا .....

کبھی نہیں!!!

نسیم وحید، گیتی

بڑے ماموں

بڑے ماموں کی زندگی خود ان کے گھر پر قاعدے قوانین کی پابند تھی۔ بڑوں کے ساتھ سعادتمندانہ اور چھوٹوں کے ساتھ مربیانہ۔ لیکن اپنی آپا یعنی ہماری امّی کے ساتھ کچھ اور۔ یہاں وہ ایک بے تکلف دوست تھے۔ ان کی آپا، محض آپا ہی نہ تھیں ان کی سب سے زیادہ گہری دوست بھی تھیں۔ جتنی بے تکلفی اور آسانی سے وہ ہر بات آپا سے کرتے اتنی بے تکلفی وہ کسی دوست سے بھی شاید ہی برتتے ہوں۔

..... کراچی آنے سے پہلے وہ تو الہ آباد ہی میں رہتے تھے اور ہماری امّی، ابّو کے تبادلوں کی وجہ سے مختلف شہروں میں قیام پذیر رہتی تھیں۔ جب بھی ہم سب کی چھٹیاں ہوتیں امّی کا الہ آباد جانا، یا بڑے ماموں کا امّی کے پاس آنا طے شدہ بات تھی۔ کبھی سیزن تفریح کا پروگرام بنتا تو بڑے ماموں اور چھوٹے ماموں اس میں ضرور شریک ہوتے چنانچہ گرمیوں میں ہم پہاڑ پر جاتے تو دونوں ماموں بھی

ساتھ ہوتے۔ ان کے بغیر جیسے ہمارا خاندان پورا نہیں ہوتا تھا۔ کراچی آنے کے بعد بڑے ماموں کو "کچھ اپنی کہنے اور کچھ آپا کی سننے" میں بڑی آسانی ہوگئی تھی۔ جب طبیعت گھبرائی آپا کے پاس پہنچ گئے۔

امی اور بڑے ماموں کی طبیعتوں میں جو ہم آہنگی تھی اور جس کی وجہ سے یہ دونوں، بہن بھائی کم اور دوست زیادہ معلوم دیتے تھے اس کی بڑی وجہ ان کے بچپن کا اپنے آبائی گاؤں مندری میں گذرنا تھا جس ماحول میں یہ دونوں پلے تھے وہ چھوٹے ماموں کے ہوش سنبھالتے ہی بڑی حد تک تبدیل ہو چکا تھا۔ جنگ عظیم اور خود ہندوستان کے سیاسی حالات نے ایک نئے دور کو جنم دیا تھا، جس کا اثر رفتہ رفتہ پرانی قدروں کو مٹاتا چلا گیا۔ بچوں میں امی اور بڑے ماموں ہی دو ایسی شخصیتیں تھیں جن کی پرورش اس ماحول میں ہوئی تھی۔ ان کے خیالات اور احساسات کی بنا یکساں قدروں پر پڑی تھی۔ اپنے دوسرے بہن بھائیوں سے ان کا رویہ اکثر بڑے نمایاں طور پر ایسا ہوتا تھا، جیسے وہ ہنس رہے ہوں۔ "ارے تم کیا جانو۔ جو ہم دیکھ چکے ہیں تمہارے لئے کہانیاں ہیں۔" ان دونوں کے درمیاں یہ ایک بڑی understanding تھی۔

باوجود اس قدر بے تکلفی کے بڑے ماموں امی کا بڑا ادب و لحاظ کرتے۔ امی کے سامنے پہلے وہ کبھی سگریٹ نہیں پیتے تھے۔ ایک مرتبہ

ان کے ہاتھ میں سگریٹ تھی کہ امی آگئیں۔ انہوں نے فوراً سگریٹ اپنے ہاتھ میں چھپالی۔ جس کی وجہ سے ان کا ہاتھ تھوڑا سا جل گیا۔ امی نے جب دیکھا تو خود ہی ان کو سگریٹ پینے کی اجازت دے دی۔ پھر بھی وہ جب سگریٹ پیتے اجازت لے کر پیتے تھے۔

ایک مرتبہ دوران گفتگو امی کچھ بات کہہ رہی تھیں کہ بڑے ماموں بیچ میں بول اٹھے "آپا آپ یہ بات غلط کہہ رہی ہیں"۔ امی کے فوراً خاموش ہو جانے سے بڑے ماموں کو خیال ہوا کہ کہیں آپا ناراض تو نہیں ہوگئیں۔ وہیں پلنگ پر امی کے پاس لیٹ گئے اور بڑی خوشامد سے امی سے پوچھنے لگے "آپا آپ کو برا تو نہیں لگا؟" پھر جب امی نے اطمینان دلادیا تب ہی وہ مطمئن ہوئے۔ ان کے تمام قریبی دوست ان کی آپا سے بھی واقف ہیں اور ہماری امی بڑے ماموں کی بدولت ایک خلقت کی "آپا" ہی ہوئی ہیں۔ کبھی کبھی بڑے ماموں کہتے "آپا آپ تو جگت آپا ہیں"۔

بڑے ماموں کا رویہ چھوٹے ماموں کے ساتھ بزرگانہ اور دوستانہ دونوں تھا۔ چھوٹے ماموں کا وہ برا لاڈ کرتے۔ ان کو کبھی یہ محسوس نہیں ہونے دیا کہ وہ ان کے محض "بڑے بھائی" ہیں دونوں میں معمولی معمولی باتوں پر خوب جھک جھک اور لڑائی ہوتی تھی۔ ایک

دوسرے کو چھیڑنے اور مذاق اُڑانے کے مواقع تلاش کئے جاتے۔ یہ لڑائیاں ہاتھا پائی تک پہنچ جاتیں تو چونکہ میدان جنگ بستر ہوتے تھے تکیئے خاص ہتھیار بن جاتے اور اس لئے دو چار تکیوں کا پھٹ جانا کوئی بڑی بات نہ تھی۔ اگر بچے بھی موجود ہوتے تو اس جنگ میں اور بھی شدت آجاتی۔

ایک مرتبہ چھوٹے ماموں اوپر بالکنی میں کھڑے ہوئے ٹماٹر کھا رہے تھے۔ اس کے عین نیچے بڑے ماموں اپنی نئی شیروانی پہنے ہوئے دوستوں سے باتیں کر رہے تھے۔ چھوٹے ماموں نے ایک آدھا کھایا ہوا ٹماٹر اُوپر سے بڑے ماموں کے کندھے پر گرا دیا۔ بڑے ماموں سخت غصہ کی حالت میں اُوپر آئے تو چھوٹے ماموں راہ فرار نہ پاکر اپنے آپ کو غسلخانہ میں بند کر چکے تھے۔ بڑے ماموں نے بھی باہر سے کنڈی چڑھا دی اور کچھ دیر پہرہ دیتے رہے۔ چھوٹے ماموں نے جب غُل مچایا تو اماں آگئیں۔ لیکن اس درمیان میں بڑے ماموں غائب ہو چکے تھے۔ چھوٹے ماموں کو اماں نے کھولا اور شور مچانے پر خوب ڈانٹا۔

چھوٹے ماموں کی طرح بڑے ماموں ہم پانچوں بھائی بہنوں سے بھی بڑا دوستانہ رویہ رکھتے۔ ہم اپنی امّی اور خالہ وغیرہ کو دیکھتے کہ جب ——— ماموں گھر میں داخل ہوتے تو سب تو ڑا

سر ڈھانک کر بڑے ادب سے بیٹھ جاتیں۔ بے ضرورت کبھی بات نہ کرتیں اور زیادہ تر کوشش یہی ہوتی کہ ان کی نظر ان پر نہ پڑے۔ اس کے برعکس ہمارے ماموں کا رویہ ہمارے ساتھ اس سے قطعی مختلف تھا۔ ہم اگر کسی وقت خاموش بھی بیٹھے ہوتے تو وہ چھیڑ چھیڑ کر باتیں کرتے، تنگ کرتے اور شور مچانا شروع کر دیتے۔ جب تک ہم لوگ الہ آباد میں رہتے وہ زیادہ تر وقت ہم لوگوں کے ساتھ ہی گزارتے۔ ہمارے ساتھ کھیلتے۔ روز شام کو کمپنی باغ کی سیر کے لئے لے جاتے۔ وہاں جا کر املی کے درختوں پر ڈھیلے برساتے اور آنکھ مچولی وغیرہ جیسے بچوں کے کھیل کھیلتے رہتے۔ وہیں بٹھا کر کہانیاں سناتے رہتے۔ اکثر ان کے دوست بھی ہمارے ساتھ ہوتے۔ وہ ان سے بیٹھ کر باتیں کرتے اور ہم لوگ ان کے قریب ہی کھیلتے رہتے۔ رات کو ان کے پلنگ پر سب بچے جمع ہو جاتے اور وہ خوب کہانیاں سناتے جن میں سے زیادہ تر تاریخی اور بچوں کی بہادری کی کہانیاں ہوتیں۔ ان میں سے اکثر تو ان ہی واقعات پر محمول ہوتیں جو وہ صبح اخبار میں پڑھ چکے ہوتے۔ رات میں ان کی عادت ہمیشہ بہت دیر سے سونے کی تھی۔ ہم لوگوں کی دلچسپیوں سے فارغ ہو لینے کے بعد وہ بہت دیر تک امی کے پاس بیٹھ کر باتیں کرتے رہتے۔

ارشاد کہ وہ حوب تنگ کرتے۔ جب وہ چھوٹا تھا تو اس کو رُلانے کی تدبیریں کرتے کیونکہ وہ روتا ہی بہت کم تھا۔ اس کے گال کھینچتے وہ بھی خوب مقابلہ کرتا اور آخر جب اس میں قوت مدافعت نہ رہتی تو زور زور سے چیخنا شروع کر دیتا۔ پھر بڑے ماموں وہاں نہ ٹھہرتے۔

ایک مرتبہ بڑے ماموں ارشاد کے پلنگ پر بیٹھ گئے۔ اس نے ضد کرنی شروع کی کہ یہ ہمارے پلنگ پر نہ بیٹھیں۔ انھوں نے بھی اصرار کرنا شروع کیا کہ ہم تو ضرور بیٹھیں گے۔ ارشاد نے زور زور سے رونا شروع کر دیا۔ مگر وہ ٹس سے مس نہ ہوئے۔ سب لوگوں نے ان کی خوشامد کی کہ ہٹ جاؤ مگر وہ نہ ہٹے۔ آخر کار بڑی خالہ ارشاد کو ہی گود میں اُٹھا کر لے گئیں اور تب کہیں یہ قضیہ ختم ہوا۔

بڑے ماموں کے ساتھ ہم لوگوں کے اس غیر معمولی رویّہ پر سب کو تعجب بھی ہوتا اور بزرگ اس کو بُرا بھی سمجھتے۔ امّی اور ابّو اکثر ہم لوگوں کو ہماری "بدتمیزیوں" کے متعلق سمجھاتے۔ کبھی کبھی ڈانٹ بھی دیتے۔ جس کے نتیجے میں ہم لوگ سنجیدہ ہو جاتے۔ بڑے ماموں جب اس زبردستی کی سنجیدگی کو دیکھتے تو اور بھی زیادہ تنگ کرنے لگتے۔ اور امّی عاجز آکر کہتیں "جیسے ماموں ہیں ویسے ہی بھانجے بھانجیاں ہیں۔ جب ماموں میں ہی بزرگی نہ ہو تو بچے ادب کیا خاک کریں۔" اتنا

سُن کر بڑے ماموں اکڑ کر رعب سے بیٹھ جاتے اور بڑا سنجیدہ بارعب چہرہ بنانے کی کوشش کرتے۔ ان کی اس حرکت پر رہی سہی سنجیدگی بھی رفو چکر ہو جاتی۔

اتنی بے تکلفی کے باوجود بڑے ماموں بدتہذیبی کبھی برداشت نہیں کرتے تھے ان سے یا کسی ملنے والے بارشتہ دار سے ہم لوگ ذرا بھی ناشائستگی برتتے تو بڑے ماموں فوراً ٹوک دیتے۔ آپس میں ہمارے ساتھ وہ خوب کھیل کود کرتے لیکن کہیں باہر ہم لوگ ان کے ساتھ جاتے تو وہ ایسے پروقار رہتے جیسے بس صرف ماموں ہیں اور ہم ان کی چہیتی بھانجیاں۔ رکھ رکھاؤ اور وضعداری کا ان کو ہمیشہ بڑا خیال رہتا تھا بڑے ماموں جس چیز کو بھی استعمال کرتے وہ ضرور "بڑھیا" ہوتی۔ ان کے کپڑے بھی قیمتی سے قیمتی ہوتے۔ اچھے کپڑے پہننے کا انہیں بے حد شوق تھا۔ مول بھاؤ کرنا ان کے بس کی بات نہ تھی۔ اکثر وہ بُری طرح تھک جاتے۔ اچھے سے اچھے درزی سے وہ کپڑا سلواتے۔ کپڑا گھر لا کر سب کو دکھاتے اور اپنی خریداری کی تعریف کرتے جاتے۔ عام طور پر اس میں کوئی ایسی خاص بات نہ ہوتی سوائے اس کے کہ دام زیادہ ہوتے۔ ایک مرتبہ قمیصوں کے لئے پاپلین لائے اور داموں کی زیادتی پر جب امّی نے تنبیہہ کی تو بڑے اطمینان سے بولے "یہ کوئی

عام پالیسی تھوڑی ہے۔ اس کو تو بادشاہ جارج ششم پہنتا ہے۔" اس وقت سے سب نے "جارج ششم کی پالیسی" ان کی چوڑ بنالی اور وہ تنگ آکر کہتے "تم لوگوں کو اچھے بُرے کی تمیز نہیں ہے"۔ ان کے کپڑے نہ صرف یہ کہ قیمتی اور اچھے سِلے ہوئے ہوتے بلکہ پہننے میں بھی بڑی خوش سلیقگی کا ثبوت دیتے۔ کوئی نیا سوٹ پہنتے اور کوئی تعریف نہ کرتا تو زبردستی کہہ کہہ کر اس کی توجہ اپنی طرف مبذول کراتے۔ تقریبات اور دعوتوں وہ اپنے کام کاج کے کپڑے پہن کر جانا پسند نہیں کرتے تھے۔ خواہ کتنی ہی دُور سے آتا ہو مگر گھر آکر نہا دھو کر اطمینان سے کپڑے تبدیل کر کے دعوتوں میں جاتے تھے۔

سوٹ پہن کر کوٹ میں پھول لگانے کا انہیں بہت شوق تھا لیکن انہیں گلاب کے علاوہ کوئی دوسرا پھول پسند نہ تھا۔ جب وہ گلاب لگا کر شان سے چلتے تو ہم سب ان کو خوب تنگ کرتے۔ کوئی ناک پکڑے سُوں سُوں کرتا ہوا بھاگتا۔ کوئی کہتا "ارے یہ گلاب میں سے بدبو کیسی آنے لگی"۔ کوئی کہتا "حسرت ان پھولوں پہ ہے جو لگ گئے ماموں کے کوٹ میں"۔ ان کے کپڑوں کی تعریف بھی اسی انداز میں ہوتی کوئی بُرا سا منہ بنا کر "ہاں اچھا ہے" کہہ کر ٹال دیتا۔ کوئی کہتا "کپڑا تو اچھا ہے مگر پہننے والا خراب ہے"۔ بڑے ماموں اسی قسم کی چھیڑ چھاڑ

سننے کے لئے کپڑوں کی تعریف خود کرنے لگتے۔

اپنے ساتھ ساتھ وہ ہم سب کے کپڑوں کی بھی بڑی خبر رکھتے۔ اسلام ارشاد بھائی یا چھوٹے ماموں اگر کبھی ٹھیک سے کپڑے نہ پہنے ہوتے تو فوراً صدائے احتجاج بلند کرتے۔ عید بقرعید کو سب لڑکیوں کے کپڑوں کا معائنہ کرتے جس کے کپڑے سب سے اچھے ہوتے اُس کو خوب شاباشی ملتی اور جس کے اچھے نہ ہوتے اس کی گوشمالی۔

بڑے ماموں کوئی کام ترتیب سے نہیں کر سکتے تھے۔ کتابیں الماری میں لگانی ہوتیں تو وہ ان کے ہاتھ سے نکل نکل جائیں۔ میز پر کاغذات بکھرے پڑے رہتے جن کو چھونے کی کسی کو اجازت نہیں تھی۔ کپڑے ان سے کبھی ٹھیک تہہ نہیں ہو سکتے تھے۔ کوئی چیز ڈھونڈھنی ہوتی تو سارا گھر سر پر اُٹھا لیتے۔ حالانکہ وہ چیز سامنے ہی میز پر رکھی ہوتی۔

استری تو وہ کبھی کر ہی نہیں سکتے تھے۔ ہم لوگوں کی خوشامد کرتے اور ہم لوگ بھی آدھی استری کر کے ہاتھ روک کے کھڑے ہو جاتے "لائیے پانچ روپے"۔ وہ دانت پیستے ہوئے پانچ کا نوٹ ہمیں دیتے اور امی سے کہتے "آپا آپ کے یہ پانچ ٹھگ تو دیوالہ کئے دیتے ہیں۔ ایسی مرمت کرونگا کہ ایک ایک کا مزاج درست ہو جائے گا"۔ امی ہم لوگوں کو ڈانٹتیں مگر دوسری دفعہ پھر یہی ہوتا۔

ماموں گانا سننے کے بہت شوقین تھے۔ ان کو خالص کلاسیکی گانے والوں میں بڑے غلام علی خاں۔ ملکہ پکھراج اور اختری بائی وغیرہ کی غزلیں بہت پسند تھیں۔ ریڈیو "سیلون" کی بکواس سے سخت نفرت تھی اور فلمی دُھنیں بھی پسند نہیں کرتے تھے۔ جب دوپہر کو گھر میں بڑی خاموشی ہو جاتی تو کہیں نہ کہیں ریڈیو لگانے کی فرمائش کرتے۔ ورنہ پھر رکارڈ لگوا کر سنتے۔ خود ان کو گانے کا بھی شوق تھا۔ کسی شاعر کا دیوان اُٹھا لیتے اور گنگنانے لگتے۔ کبھی بہت موج میں آتے تو زور سے تان اُڑانے لگتے۔ ان کی آواز میں نہ لے ہوتی نہ سُر ہوتا صرف ان کی پُر شوق طبیعت ہوتی۔ اس پر ان کو "تان سین کے چچا" کے خطاب سے نوازا جاتا۔

بڑے ماموں کی طبیعت میں صفائی اور نفاست بہت تھی۔ ہمارے گھر جب بھی وہ آتے اچھی طرح منہ ہاتھ دھو کر باتیں کرنے کے لئے بیٹھتے اگر سارے دن رہنا ہوتا تو کپڑے فوراً تبدیل ڈالتے۔ صبح ناشتہ بھی نہا دھو کر اطمینان سے کرتے۔ چھوٹے ماموں دیر سے اُٹھنے کی وجہ سے جلدی جلدی منہ ہاتھ دھو کر ناشتہ پر آ بیٹھتے تو بڑے ماموں فوراً صدائے احتجاج بلند کرتے۔ کچھ بگڑتے کچھ شرم ڈالتے اور دوسرے بچوں کی مثال دیتے۔ لیکن چھوٹے ماموں ایک چپ ہزار بلا ٹالے پر قائم

رہتے تو آخر بڑے ماموں خاموش ہو جاتے لیکن تھوڑے تھوڑے وقفہ سے اپنی ناپسندیدگی کا اظہار کرتے جاتے۔

چائے سے زیادہ بڑے ماموں کو کافی پسند تھی۔ اکثر رات کو کھانا کھانے کے بعد کبھی ہم لوگوں کو لے کر کبھی اکیلے ہی "ممتاز بہن" کے گھر ان کے ہاتھ کی کافی پیتے چلے جاتے۔ ایک زمانے میں ان کو پان کھانے کا شوق ہوا۔ کھانا کھانے کے بعد پان ضرور کھاتے۔ ان کا مقولہ تھا کہ "جس گھر میں پاندان نہ ہو اور لوگ اپنے مہمانوں کی تواضع پان سے نہ کرتے ہوں وہ کم شناس تہذیب ہیں"۔ اگر کبھی ان کو چھوٹا سا پان بنا کر دیتے تو کہتے "بھئی یہ کیا۔ اُونٹ کے منہ میں زیرہ"۔ غذا کا جہاں تک ان کا کام اجازت دیتا بہت خیال رکھتے۔ سادہ اور بہت اچھا پکا ہوا کھانا انہیں پسند تھا۔ مرغن غذائیں ان سے چلتی ہی نہ تھیں۔ اچار، مربّہ، دھنیا، پودینہ کی چٹنی اور ہری مرچ تو ان کو اتنی مرغوب تھی کہ دعوتوں میں بھی فرمائش کر بیٹھتے تھے۔ کھانا بڑے شوق سے اور مزے لے لے کر کھاتے ساتھ ہی خوب باتیں بھی کرتے جاتے۔ ان کو جب دیر سے آنے کی وجہ سے اکیلے ہی کھانا کھانا پڑتا اور کوئی پاس بیٹھ کر باتیں کرنے والا بھی نہ ہوتا تو وہ کھانا ہی نہیں کھاتے تھے۔

بڑے ماموں کو کھیل کود کا بچپن ہی سے بہت شوق تھا۔ اسکول

اور کالج میں ہمیشہ نمایاں طور پر کھیل میں حصہ لیتے رہے۔ گھر پر بھی چھوٹے موٹے کھیل کھیلتے رہتے۔ چنانچہ ارشاد کے ساتھ اس کا چھوٹا سا بلّا لے کر گیند بلا کھیلنے کھڑے ہوتے تو معلوم ہوتا کہ عوج بن عنق نے تنکا پکڑ رکھا ہے۔ گھر کی چھت پر دونوں ماموں اور ہمارے بھائی کرکٹ کھیلتے۔ اس وقت تو معلوم ہوتا کہ کھیل کا میدان چھوٹا ہو گیا ہے کھلاڑی بہت زیادہ ہو گئے ہیں۔ چھوٹی سی آنگن تھا۔ گیند بار بار نیچے جاتی اور اس کے لئے بڑی دوڑ بھاگ ہوتی رہتی۔ باغ میں ٹہلنے اور گھاس پر بیٹھنے میں بھی ان کو بہت لطف آتا تھا۔

وہ مطالعہ کے شوقین جتنے بڑے تھے شاید ہی کوئی ہوگا۔ اچھی بری ہر قسم کی اور ہر موضوع کی کتاب پڑھتے۔ رات کو بہت دیر تک پڑھتے رہتے۔ صحافیانہ مصروفیات کی وجہ سے دیر سے گھر آتے۔ لیکن چاہے وہ ہی کیوں نہ بج چکے ہوں کم سے کم آدھے گھنٹے پڑھ لینے کے بعد ہی ان کو نیند آتی تھی۔ روزانہ رات کو جب وہ آتے تو ان کے ہاتھ میں کوئی نہ کوئی نئی کتاب، رسالہ یا اخبار ضرور ہوتا۔ ان کی زیادہ تر دلچسپی سیاسی اور تاریخی کتابوں سے تھی۔

مطالعہ اور گپ شپ کے مقابلہ میں سیر و تفریح سے زیادہ دلچسپی نہیں تھی لیکن پکنک وغیرہ پر جب جاتے اچھی طرح لطف اُٹھاتے تھے۔

ایک مرتبہ ہم لوگوں نے ایک بہت بڑی پارٹی بنائی اور منورا پر پکنک کے لئے گئے۔ سب لوگ سمندر میں خوب نہائے پانی میں کھیلے۔ اسی اثنا میں ایک بڑی لہر آئی اور بڑے ماموں اس کے ساتھ بہہ کر کافی دُور تک سمندر میں چلے گئے۔ ہم سب دم بخود رہ گئے

ابو تیرنا جانتے تھے ان کو بڑی مشکلوں سے گھسیٹ کر باہر لائے۔ اس دن تو بڑے ماموں نے جیسے دوسری زندگی پائی تھی۔ سب نے اطمینان کا سانس لیا۔ بڑے ماموں کپڑے وغیرہ بدل کر دوبارہ سمندر میں جانے سے توبہ کر چکے تھے۔ ان کا اس دن خوب مذاق اُڑایا گیا۔ اور "مرزا بے بس" کے نام سے پکارے جانے لگے۔

بڑے ماموں کا سب سے بڑا شوق باتیں کرنا تھا۔ عام ملاقاتیوں، رشتہ داروں اور باتکلف جگہوں پر وہ بہت خاموش رہتے۔ لیکن گھر کے لوگوں سے اور خاص خاص دوستوں سے خوب باتیں کرتے۔ ایسی بے تکلف محفلوں میں زیادہ تر ایسا ہوتا کہ صرف بڑے ماموں ہی بولتے اور سب خاموشی سے ان کی باتوں کا لطف اُٹھاتے۔ ان کے بات کرنے کا ایک مخصوص انداز تھا۔ فقرہ چست کرنے اور نئے نئے خطابات دینے میں وہ بڑے مشاق تھے۔ دوران گفتگو وہ اکثر ایک آدھ جملہ بڑا ہی برجستہ کہہ جاتے دیر تک کانوں میں گونجتا رہتا۔ ایک زمانہ میں جب

عالیہ عسکری ہمارے یہاں ٹھہری ہوئی تھیں اکثر بڑی علمی ادبی اور سیاسی بحثیں ہوتی رہتیں۔ ایک دفعہ بحث کے دوران ماموں نے کہا "گھریلو زندگی قوتِ ارادی ختم کر دیتی ہے"۔ عالیہ عسکری غور کرتے کرتے اس جملہ میں اس قدر محو ہوتیں کہ جب کچھ دیر بعد وہ ہمارے ساتھ باہر جا رہی تھیں تو ان کو کسی چیز کا ہوش نہیں تھا اور وہ ایک بڑے تناور درخت سے ٹکراتے ٹکراتے بچیں۔

جنوری ۵۳ء کی اسٹرائک کے زمانہ میں طلبا کا ایک مطالبہ یہ بھی تھا کہ حکومت تمام تعلیم یافتہ نوجوانوں کو روزگار فراہم کرے بعض طلبا اس کے خلاف بھی تھے۔ ہمارے کالج میں ایک صاحبہ نے خاص طور پر اس کے خلاف بحث چھیڑ دی ان کے نزدیک یہ بات قطعی ناممکن تھی۔ طلبا کی اس یکجہتی کے زمانہ میں ان کی یہ کٹ حجتی کچھ اس قدر نمایاں ہوئی کہ ایک دفعہ بڑے ماموں سے باتوں میں اس کا بھی ذکر آگیا۔ انھوں نے اطمینان سے ہماری پوری بات سُنی پھر بولے۔ "ان صاحبہ سے پوچھا نہیں کہ وہ کسی ایسے نوجوان سے شادی کرلیں گی جو پریشان حال اور بے کار ہو؟" ہم نے سوچا کہ واقعی ان کو قائل کرنے کے لئے دلائل اور بحث مباحثہ کی ضرورت نہیں تھی۔ صرف یہی ایک سوال کافی تھا۔

بڑے ماموں کی مختصر سی سیماب صفت زندگی کی کامیابی کا یہ ایک ثبوت ہے کہ ان کا گرد و پیش ان کے رنگ میں رنگ گیا۔ بچوں اور بوڑھوں سب نے ان کو صائب الرّائے مانا۔ ان کے خیالات اور ان کی شخصیت ایسی ہمہ گیر تھی کہ آج یہ کہنا کہ بڑے ماموں ہم میں نہیں ہیں "غلط" معلوم دیتا ہے۔

رفتید، ولے نہ از دلِ ما

(چند قرار دیں)

انجمن صحافیان کراچی کی مجلس عاملہ نے اپنے شدید افسوس کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ "اختر کو کھو کر انجمن عامل صحافیوں کے ایک پرخلوص مجاہد سے محروم ہو گئی ہے۔ وہ انجمن کی ابتدا سے اس سے منسلک تھے اور دو مرتبہ انجمن کے جنرل سیکریٹری منتخب ہوئے۔ پاکستانی صحافیوں کی وفاقی انجمن (پی۔ ایف۔ یو۔ جے) کی تشکیل میں بھی انھوں نے ممتاز حصہ لیا"

انجمن نے یہ طے کیا کہ اختر کی یاد میں ہر سال مضامین کا ایک بین الکلیاتی مقابلہ کرایا جائے، اور مقابلہ میں اوّل، دوم اور سوم آنے والوں کو انعامات دیئے جائیں۔ یہ مقابلہ ہر سال دسمبر میں ہوا کرے گا اور اختر میموریل کے نام سے یاد کیا جائے گا۔

کراچی پریس کلب کی مجلس عام نے اپنی قرارداد میں کہا "اختر کلب کے

بانیوں میں سے تھے۔ ان کی موت سے ہم ایک انتہائی ممتاز اور ہر دلعزیز صحافی اور اپنے ایک پُرجوش رکن سے ہی محروم نہیں ہوئے بلکہ ایک منس مکھ اور دلکش شخصیت بھی ہم سے چھن گئی۔ اختر کی کمی ہمیں ہمیشہ محسوس ہوتی رہے گی، خصوصیت کے ساتھ ان لمحوں میں جب کوئی دل بڑھانے والا ہمارے درمیان نہیں ہوگا"

نیوچائنا نیوز ایجنسی کے نمائندہ وانگ شونے ڈاکٹر محمد سرور کو لکھا" میں جب سے یہاں آیا ہوں، اختر نے اپنے دوستانہ تعلق سے مجھے کبھی یہ محسوس نہیں ہونے دیا کہ میں ایک غیر ملک میں ہوں۔ اس تعلق کی یاد مجھے ہمیشہ عزیز رہے گی اور اس کی صحافیانہ لیاقت، اپنے ملک اور حق وصداقت سے اس کی محبت اور انسانیت کی بھلائی کے لئے اس کی کوششیں ہمیشہ میری ہمت بڑھاتی رہیں گی۔

روزنامہ "لیڈر" نے اپنے اداریہ میں لکھا" اختر کی بے وقت موت سے یہ اخبار ایک قابل رپورٹر، ملک ایک ہونہار صحافی اور ہمارے کھیل ایک اچھے مبصر سے محروم ہوگئے"

امروز۔ کراچی نے اس اچانک حادثہ کی خبر دیتے ہوئے کہا "موت کے بے رحم ہاتھوں نے آج انجمن صحافیان کراچی سے اس کے سرگرم جنرل سیکریٹری کو، دارالحکومت کی صحافت سے ایک جواں سال و جواں عزم صحافی کو، بوڑھے والدین اور چھوٹے بھائی بہنوں سے ایک اچھے بیٹے اور بھائی اور دوستوں سے ایک رفیق و یار کو چھین لیا"

ان کے علاوہ وزیر اطلاعات مسٹر حبیب الرحمٰن، جنرل سیکریٹری پاکستان فیڈرل یونین آف جرنلسٹس، نیشنل ایسوسی ایشن آف جرنلسٹس، جنرل سیکریٹری ایسٹ پاکستان یونین آف جرنلسٹس، انجمن صحافیان کراچی کے امروز اور ٹائمز آف کراچی یونٹ، پاکستان پریس ایسوسی ایشن، محکمہ اطلاعات حکومت پاکستان، انجمن خوش نویسان کراچی، کراچی یونیورسٹی کی جنرل ہسٹری سوسائٹی، کراچی کرکٹ ایسوسی ایشن، آغا خان جم خانہ، سر عبداللہ ہارون مسلم جم خانہ، ڈائرکٹر آف برٹش انفارمیشن سروسز اور روزنامہ "سنگ باد" ڈھاکہ، انگریزی ہفتہ وار "نیو ورلڈ" اور متعدد دوسرے اخبارات، انجمنوں اور اداروں نے بھی اختر کی بے وقت موت پر اپنے دلی رنج و غم کا اظہار کیا۔

اک تری ذات چھن گئی
ورنہ دنیا میں کیا نہیں

ویراں ہے میکدہ ، خم و ساغر اداس ہیں

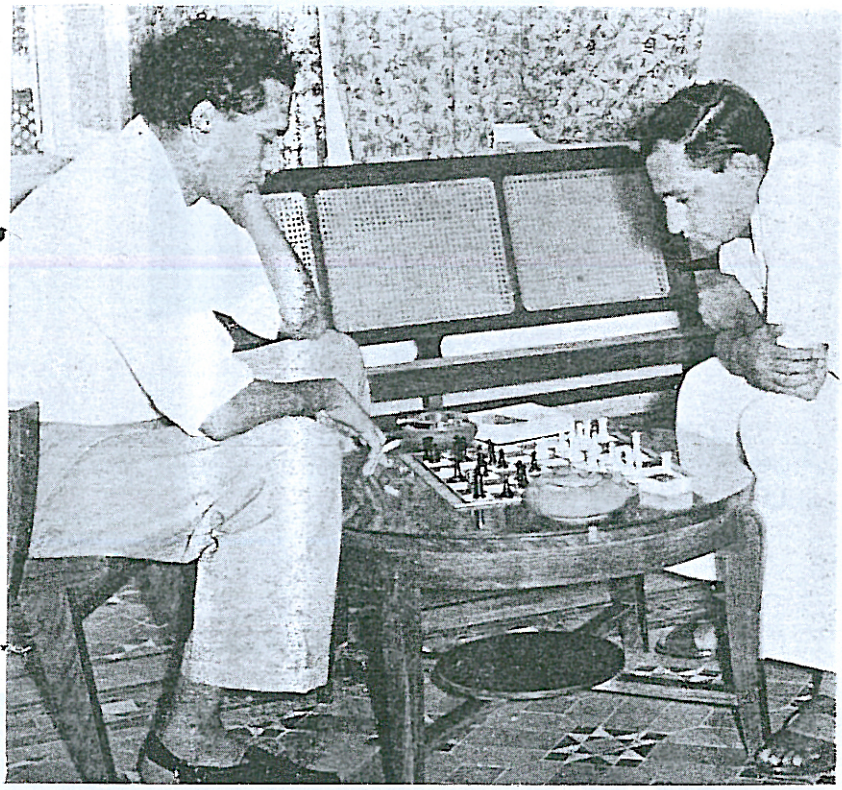

ں جان کی بازی ہار گئے
ں عمر کا رشتہ توڑ لیا

"اختر"
کارٹونسٹ عزیز کا ایک نقش

اختر کے خطوط

اُس کی باتوں میں گلوں کی خوشبو

۱۹۵۴ میں کراچی میں نقوی صاحب کا دورِ حکومت تھا اور آزاد خیال لوگوں پر ان کی نظرِ نوازش اکثر رہتی تھی۔ اختر نے بھی دس مہینے کراچی جیل میں گزارے تھے۔ چھوٹے بھائی سرور کچھ دن پہلے ہی وہاں جا چکے تھے۔ آئندہ صفحات میں خطوط کے پیرائے میں انہی ایام کی داستان ہے۔ اس سے معلوم ہوگا کہ آہنی سلاخیں اور سنگین دیواریں نہ عزمِ محکم کو جھکا سکتی ہیں نہ انسان کی خلقی خوش دلی کو پامال کر سکتی ہیں۔ رُوح کی خوش دلی اور تابندگی وہ

سبزہ ہے کہ وقتی طور پر اصحابِ اقتدار کی پامالی سے دب تو سکتا ہے لیکن اُسے کچلنا اور آئندہ اُبھرنے سے روکنا کسی کے بس کی بات نہیں۔

اختر نے جیل میں جانے کے بعد حسبِ قاعدہ اپنی فردِ جرم طلب کی — انہیں سزا پر اعتراض نہ تھا فقط یہ معلوم کرنا چاہتے تھے کہ الزام کیا ہے۔ جواب ملا تم سرور کے بھائی ہو۔ اور سرور کا قصور کیا تھا —؟ کراچی کے طالب علم دل و جان سے اس کو رہنما مانتے تھے۔ اب نقوی صاحب اور ان کا دورِ حکومت دونوں تاریخِ پارینہ کا جزو ہیں۔ لیکن اختر ان خطوط میں زندہ چلتے پھرتے ہنستے بولتے نظر آئیں گے۔ انہیں ادیب ہونے کا دعویٰ نہ تھا لیکن پڑھیئے تو پتہ چلے گا کہ ان کی انشا میں کس قدر بے ساختگی تھی بانکپن تھا، دلآویزی تھی۔

فہرستِ خطوط

۱ آپا جان کے نام

۲ شاہدہ کے نام

۳ والدہ کے نام

۴ آپا جان کے نام

۵ آپا جان کے نام

۶ شیریں اور گیتی کے نام

۷ آپا جان کے نام

۸ شاہدہ اور سعیدہ کے نام

۹ شاہدہ اور سعیدہ کے نام

۱۰ شاہدہ کے نام

۱۱ شاہدہ کے نام

۱۲ شیریں کے نام

۱۳ گیتی کے نام

۱۴ گیتی کے نام

۱۵ شاہدہ کے نام

۱۶ شاہدہ کے نام

۱۷ شیریں کے نام

۱۸ شاہدہ کے نام

۱۹ گیتی کے نام

۲۰ گیتی کے نام

۲۱ آپا جان کے نام

نوٹ

آپا جان سے مراد صادقہ ہیں۔ اختر کی بڑی بہن (اہلیہ ڈاکٹر وحید الدین صاحب)۔ اختر ان سے کوئی سات برس چھوٹے تھے اختر سے چھوٹے سرور ہیں (ڈاکٹر محمد سرور)۔ اختر اور ان کی عمر میں تین سال کا فصل ہے۔ باقی سب بہنیں ان سے چھوٹی ہیں۔ ساجدہ۔ شاہدہ۔ راشدہ اور سعیدہ۔ ان میں ساجدہ تو شادی شدہ ہیں اور مدت سے اپنے گھر میں بستی ہیں۔ ان سے چھوٹی تینوں بہنیں کالج کے مختلف درجوں میں زیر تعلیم ہیں۔ شیریں اور گیتی صادقہ کی بچیاں یعنی اختر کی بھانجیاں ہیں۔ گیتی (نسیم وحید) اور سعیدہ کے مضامین بھی اس مجموعے میں شریک ہیں۔

کراچی جیل
۵ جون ۱۹۵۴ء

پیاری آپا جان! تسلیم

عید مبارک۔ آپ کا بھیجا ہوا کھانا بڑے موقع سے آیا اور ہماری عید ہو ہی گئی۔ اسلام کا عید کارڈ دیکھ کر آپ لوگ بہت یاد آئے۔

ویسے جیل میں بھی دن بھر ریکارڈنگ ہوتی رہی۔ اگر آپ لوگ اس طرف سے گزرے ہوں گے تو آپ نے بھی سنا ہوگا۔ رات کو جیل کی طرف سے ہم لوگوں کو بریانی بھی دی گئی جو ہمنے آج صبح ناشتہ پر کھائی کیونکہ گھر سے کھانا آگیا تھا

مجھے اور میرے چند اور دوستوں کو آج بی کلاس دے دیا گیا

ہے اور ہمارے کمروں میں ایک میز اور ایک ریک کا اضافہ ہوگیا ہے۔ ویسے یہاں وقت اچھا خاصہ گزر رہا ہے۔ صبح کوئی چھ بجے سو کر اُٹھ جاتا ہوں پھر تھوڑی سی ورزش کرنے کے بعد آٹھ بجے چائے پی جاتی ہے۔ اس کے بعد اخبار دیکھتے ہیں اور پھر دن گزر ہی جاتا ہے۔ رات میں عجیب سی خاموشی ہوتی ہے جو کبھی کبھی چوکیدار کی آواز سے ٹوٹ جاتی ہے۔

الہ آباد سے کوئی خط آیا؟ آماں کب آرہی ہیں اور سب کا کیا حال ہے؟۔ اسلام ارشاد سے کہئے گا کہ ٹسٹ (test) قریب آرہا ہے بڑی ٹھکائی ہوگی اُن کی ٹیم کی۔ ان سے کہئے گا کہ سعید[1] صاحب سے تصویروں کے لئے ٹیلیفون پر بات کرلیں۔ اُن کو معلوم ہے کہ ان دونوں کو بہت شوق ہے لہٰذا وہ ان کو دے دیں گے۔ پہلی تصویریں جو میں نے ان کو دی تھیں۔ میری غلطی سے ان کے بلاکس blocks پر نام نہیں لکھے گئے تھے۔ اگر کسی روز یہ لوگ تصویریں لے کر ہمارے دفتر چلے جائیں، کوئی گیارہ بجے، تو بلاکس پر نام لکھے جاسکیں گے۔ ورنہ ہمارے دفتر میں تو ان انگریز کریکٹرز (CRIC KEIEPS) کو کوئی اور پہچانتا بھی نہ ہوگا۔ اگر یہ نہ ہوسکے تو کمرے میں جو کوٹ ٹنگا ہوا ہے، اس میں ان بلاکس کا پروف پڑا ہوا ہے، اسے بھیجدیں۔

[1] سعید صاحب۔ اس زمانہ میں ٹائمز آف کراچی میں نیوز ایڈیٹر تھے۔ اب سول اینڈ ملٹری گزٹ (لاہور) میں ہیں۔

شیریں، گیتی، شاہدہ، راشدہ اور سعیدہ کو دعا اور پیار۔ ساجدہ آئے تو اسے اور اس کے بچوں کو میری طرف سے پیار کر لیجئے گا۔ ابا اور بھائی صاحب کی خدمت میں آداب قبول ہو۔

ہاں میری سفید بُش شرٹ راج محمد سے کہیئے گا کہ سنو وہائٹ کے یہاں سے لے آئے۔ اس کی رسید بھی کوٹ کی جیب میں رکھی ہے۔ اگلے ہفتہ اگر ہو سکے تو ایک سیر چینی بھیج دیجے گا اور وہ بُش شرٹ اور ایک معقول سا پتلون بھی۔

سرور وغیرہ علیحدہ ہیں۔ دیگر پُرسان حال کو سلام عرض ہے۔ اُمید ہے کہ آپ سب لوگ بخیریت ہوں گے۔

اختر

کراچی سنٹرل جیل
۲۶ جون ۱۹۵۴ء

شاہدہ !

آم اور مرچ کا آچار، نمک پارے اور کھجور جو تم نے بھیجے تھے مل گئے۔ بہت اچھے بنے ہوئے تھے بہت بہت شکریہ۔ پتہ نہیں راشدہ کو داخلہ مل گیا یا نہیں۔ ویسے میں نے آج ایک پوسٹ کارڈ 'مشیر' کو بھی لکھ دیا ہے۔ اگر کوئی دقت ہو تو 'مشیر' یا 'ہارون' سے کہلا دینا وہ لوگ جو بھی کر سکتے ہیں ضرور کریں گے۔ گیتی اور سرور کا نتیجہ ابھی تک نہیں آیا۔

آماں سے کہو پریشان ہونے کی کوئی ضرورت نہیں۔ میں یہاں بالکل ٹھیک ہوں۔ آج کل ہم لوگ شام کو والی بال کھیلتے ہیں۔ اچھا

خاصہ کھیل ہو جاتا ہے۔

اب کچھ سُن لو یہاں کی زندگی کے متعلق بھی تھوڑا سا! میں صبح چھ بجے تک اُٹھ جاتا ہوں۔ اسی وقت ہماری کوٹھری کے دروازے بھی کھُل جاتے ہیں۔ اس کے بعد نہا دھو کر کوئی ساڑھے آٹھ بجے ناشتہ ہوتا ہے۔ جس میں ہم کو آدھی گولی مکھن اور پاؤ روٹی چائے کے ساتھ ملتی ہے۔ اس کے بعد اخبارات آجاتے ہیں۔ یہاں سے 'ڈان' اور 'جنگ' مل جاتے ہیں۔ 'پاکستان ٹائمز' اور 'ٹائمز آف کراچی'، ہم دونوں بھائیوں کے نام آتے ہیں۔ اخبار پڑھنے کے بعد کچھ لوگ برج کھیلتے ہیں اور کچھ لوگ اپنے اپنے سیل (cell) میں پڑھتے رہتے ہیں۔ دوپہر کو بارہ بجے کھانا کھاتے ہیں اور اس کے بعد شام کو چار بجے چائے۔ پانچ بجے سے چھ بجے تک کھیل۔ اور پھر رات کا کھانا کھا کر سات یا سوا سات بجے ہم اپنے ڈربوں میں بند کر دیئے جاتے ہیں، صبح تک کے لئے۔ تو یہ ہے یہاں کا معمولِ زندگی۔ پڑھائی کافی ہوتی ہے کتابیں ابھی میرے پاس ہیں۔ اس لئے بھیجنے کی ضرورت نہیں۔

ہمارا کھانا پکانے کا انتظام بھی علیحدہ ہے۔ ایک کھانا پکانے والا۔ اور دو اُوپر کے کام کرنے کے لئے قیدی ملے ہیں۔ کھانا اچھا

خاصہ پک جاتا ہے۔ انیس ہاشمی امور خانہ داری میں ماہر ہیں۔ اُن کی وجہ سے کھانے وغیرہ کا انتظام خاصہ معقول ہو جاتا ہے۔ کچھ حضرات کی رائے تھی کہ یہ کام میں اپنے ذمہ لے لوں۔ میں نے کہا کہ اگر آپ لوگ اس پر تیار ہوں کہ اکثر کھانا آپ لوگوں کو نہ ملے تو بندہ حاضر ہے اس کے بعد گنجائش ہی باقی نہیں تھی کہ یہ اہم کام میرے سپرد ہوتا۔

میرا خیال ہے تم لوگ 'سرور' سے ملنے یکم جولائی کو ضرور آؤ گی۔

بی ساجدہ اور ان کے میاں کیسے ہیں؟ مجھے ان کا پتہ نہیں معلوم ورنہ ایک خط ان کو بھی لکھتا۔ آماں اور ابا کی خدمت میں آداب قبول ہو۔ ہارون اور انیس آئیں تو ان سے سلام کہہ دینا۔ ویسے اگر وہ خط لکھیں تو کیا کہنا۔ آپا اور بھائی صاحب کی خدمت میں بھی سلام کہہ دینا۔ بچوں کو دعائیں۔

اختر

۱۴ جولائی ۱۹۵۴ء

مکرمی و محترمی جناب والد صاحب قبلہ! تسلیم

آپ کا پوسٹ کارڈ ۱۲ر جولائی کو ملا۔

میں نے ابھی (سی سی[1]) کو جواب نہیں دیا ہے۔ ارادہ ہے اگلے ہفتہ یہ کام بھی کر ڈالوں۔ آپ اطمینان رکھیئے، میں اعتدال کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑوں گا۔

معلوم ہوا ہے کہ اب ملاقات کا طریقہ بدل گیا۔ صرف منگل کو اجازت ہوا کرے گی اور کوئی interview ملاقات بغیر (چیف کمشنر) کی اجازت کے نہ ہو سکے گی۔ اس لئے آپ آئندہ منگل کیلئے سی۔سی کے دفتر میں درخواست دے دیجئے گا۔

میں آج کل HISTORY PARABS (تاریخ عرب) جسے P. Hitti (پی۔ ہٹی) نے لکھا ہے پڑھ رہا ہوں۔ اس کے بعد

[1] چیف کمشنر کراچی

Arabs in History (عرب تاریخ میں) جو ؛ Bernard Lewis (برنارڈ لوئی) کی ہے پڑھنے کا ارادہ رکھتا ہوں۔ دیکھئے شاید میرے کسی دوست کے پاس یہ کتاب مل جائے۔ اس کے علاوہ Man's Worldly Goods (انسان کا دنیوی سرمایہ) بھی اگر آپ بھیج سکیں تو بڑی شفقت ہوگی۔

مجھے ایک کینوس کے جوتے کی ضرورت ہے۔ ۱۰ نمبر میں پہنتا ہوں۔ اس کے علاوہ میرے کچھ کپڑے بھی بھیج دیجئے۔

گزشتہ ہفتہ آماں جو حلوہ لائیں تھیں وہ کل صبح ختم ہوا۔ بہت اچھا تھا۔ سب ہی نے تعریف کی۔

سرور نے درخواست روانہ کر دی ہے۔ اسی وجہ سے گزشتہ ہفتہ، وہ خط نہیں لکھ سکے۔ میں نے ایک خط گزشتہ بدھ کو شیریں کے نام بھیجا تھا۔ پتہ نہیں ملا کہ نہیں ملا۔

اور سب خیریت ہے۔ بزرگوں کی خدمت میں سلام عرض ہے بچوں کو دعا۔

آئس کریم اس گرمی میں بہت کام آئی۔ ویسے بھی بہت دنوں کے بعد کھائی تو لطف آگیا۔

اختر

۲۷ جولائی ۱۹۵۴ء

محترمہ جناب ہمشیرہ صاحبہ! تسلیم

۲۲ر جولائی کو ایک خط گیتی کے نام روانہ کر چکا ہوں۔ اُمید ہے کہ مل گیا ہوگا۔ گیتی کا ۱۴ر کا لکھا ہوا خط مجھے ۲۱ جولائی کو ملا تھا۔

میرا پاؤں ابھی تک ٹھیک نہیں ہوا۔ ویسے پہلے سے بہتر ہے۔ اُمید ہے کہ ایک ہفتہ میں ٹھیک ہو جائے گا۔ آپ لوگ قطعی پریشان نہ ہوں۔

سرور سے ملنے آپ لوگ جب آئیں تو بلیڈ اور صابن وغیرہ ضرور لیتی آئیں۔ اماں کیسی ہیں۔ بھئی ان سے کہئے کہ اپنی صحت کا خیال رکھیں۔

اور ہم دونوں خیریت سے ہیں۔ "بالو"[1] کو اور دوسرے

[1] ڈاکٹر اقبال وحید کی عرفیت جو مرحوم کے بڑے بھانجے ہیں۔

بچوں کو بہت سا پیار۔

بھائی صاحب کی خدمت میں آداب قبول ہو۔

اختر

آخر

۴۔ اگست ۵۴ء

پیاری آپا! تسلیم

اس وقت ساڑھے سات بجے ہیں۔ شام کا وقت ہے اور ہم لوگ ابھی ابھی اپنی اپنی cells (کوٹھریوں) میں بند ہوئے ہیں۔ یہاں آنے سے پہلے اس وقت میں عام طور پر اپنے دفتر میں ہوتا تھا۔ اور اگر کوئی کام نہیں ہوتا تھا تو تفریح کا پروگرام بنتا تھا۔ میں ہمیشہ ان اوقات میں کام کرنا پسند کیا کرتا تھا۔ دراصل اخبار والوں کا کام اسی وقت زیادہ ہوتا ہے۔ دن بھر کی دوڑ دھوپ کے بعد لکھتے اسی وقت ہیں۔ خیر یہ تو قصہ پارینہ ہوا۔ یہاں اس وقت پڑھنے بیٹھ جاتے ہیں۔ گیارہ بجے تک پڑھتے رہے اور پھر سو گئے۔

کل اور آج گرمی کافی رہی۔ ویسے تھوڑی دیر کے لئے شام کو موسم قدرے بہتر ہو گیا تھا۔ لیکن اس وقت تو ہوا بند ہے۔ باش

کے آثار تو ہیں۔ خدا کرے زور کی بارش ہو جائے۔

جب سے پیر میں چوٹ لگی ہے میں نے کچھ زیادہ نہیں پڑھا۔ شروع میں درد چونکہ کافی تھا اس لئے پڑھنا بالکل ناممکن تھا لیکن ادھر میں بالکل ٹھیک ہوں (سوائے تھوڑا سا لنگڑا کر چلنے کے) لیکن پھر بھی اچھی پڑھائی نہیں ہو رہی ہے۔

اس وقت یہاں بسوں اور کاروں کے ہارن کی آواز آ رہی ہے۔ دیکھئے باہر کی دُنیا سے اس قدر قرب کے باوجود بھی ہم کتنے دُور ہیں۔

بھئی کچھ تھوڑی سی ہوا تو چلی۔ معلوم ہوتا ہے اللہ میاں نے سُن لی۔ اور اب اس وقت پانی برس جائے تو لطف ہی آ جائے۔

گیتی کا خط سرور کے نام آیا تھا۔ اس نے ہماری سوئٹزر بننے کی خوش خبری سُنائی تھی۔ بڑا نیک ارادہ ہے۔ اگر یہ صرف ارادہ ہی ہے تو ٹھیک نہیں ہے۔ ویسے سوئٹزر کی ضرورت تو غالباً اکتوبر میں پڑے گی۔

تو اسلام صاحب بہت خوش ہیں۔ بھئی اس کا کیا علاج ہے کہ بارش کی وجہ سے ہماری ٹیم کھیل ہی نہ سکی۔ خیر آئندہ ٹسٹ میں دیکھا جائے گا۔ مجھے یقین ہے کہ اس مرتبہ بارش نہیں ہو گی اور ہندر لوگ قطعی ہاریں گے۔

اور سنائیے کیا ٹھاٹھ ہیں۔ کوئی معقول سی پکچر دیکھی؟ بھئی ان دو مہینوں میں انگریزی کی تو کئی بہترین فلمیں دکھائی گئیں۔ بہترین اس لئے لکھا کہ کچھ کے بارے میں تو REVIEW (ریویو) پڑھنے سے اندازہ ہوا اور کچھ کے متعلق ہم نے جیل آنے سے پہلے پڑھ رکھا تھا۔

پڑوس کی کوٹھڑی میں انیس صاحب غالب کی غزل "نکتہ چیں ہے غم دل" گنگنا رہے ہیں۔ انیس صاحب کبھی کبھی اچھی غزلیں گاتے ہیں۔ ویسے اس بیرک (barrack) میں ایک وہی اکیلے تان سین ہیں۔ اس لئے جیسے بھی ہیں غنیمت ہیں۔

آج ہم نے شام کو چائے کی بجائے کافی پی۔ ادھر کوئی ایک ہفتہ کے بعد بنی اس لئے بہت بھلی معلوم ہوئی۔ میرا جی تو روزانہ کافی پینے کو چاہتا ہے۔ لیکن یہاں اور لوگ چائے کے زیادہ دلدادہ ہیں اس لئے میں اپنے اکیلے کے لئے کافی بنوانا پسند نہیں کرتا۔ ویسے آپ تو جانتی ہیں کہ ہمیں چائے سے کوئی بیر تھوڑا ہی ہے۔ ان لوگوں کی یہ بدمذاقی دیکھئے کہ یہ کافی کے رسیا نہ ہو سکے۔

اچھا یہ تو بتائیے ہمارے پچھلے خطوط ملے کہ نہیں؟ سخت تعجب ہے کہ سرور کا ۱۴۔ جولائی والا خط آپ کو ۲۹ کو ملا۔ میں اس کے بعد گیتی و سعیدہ کو لکھ چکا ہوں۔ اُمید ہے ملے ہوں گے۔

آپا، یہاں کپڑے جلدی میلے ہوتے ہیں۔ دیکھئے ہر ہفتہ ہمیں پلنگ کی چادر اور تکیہ کا غلاف ضرور بھجوا دیا کیجئے۔ یہ چادر جو میں نے بچھا رکھی ہے میلی ہو چلی ہے۔ اس لئے خط ملتے ہی چادر ضرور روانہ کر دیجئے۔ بالو، شیریں، گیتی اسلام اور ارشاد کو دعا۔ اماں ابا اور بھائی صاحب کی خدمت میں آداب۔

اختر

یہ خط میں نے ابھی ختم ہی کیا تھا کہ بارش ہونے لگی۔ اس وقت موسم بڑا اچھا ہو گیا ہے۔ دیکھی آپ نے میری پیشینگوئی!

۱۴ اگست

پیاری بچیو! دعائیں

تم سب لوگوں کو جشن آزادی مبارک ہو۔ ہم یہاں زنداں میں ہیں مگر تم سب کی خوشیوں اور مسرتوں میں شریک ہیں۔ میں رات میں فیضؔ کی نظم جو انھوں نے آج سے سات سال پہلے لکھی ہے گنگنا رہا تھا۔ بڑی موسیقیت ہے اس نظم[1] میں۔

میں اچھا ہوں۔ پیر میں اب تھوڑی سی سوجن رہ گئی ہے۔ درد اب نہیں ہے۔ سوجن بھی جاتی رہے گی۔ ویسے اپنے دردِ دل کے لئے تین تین دن تک جناح اسپتال جاتا رہا۔ کرنل شاہ نے دیکھا۔ ریڈیو کارڈوگرام (adio cardiogram) بنوالیا گیا۔ سینے کا بھی ایکس رے (X. ray) ہوا۔ بلڈ پریشر (blood

---

[1] اس نظم کی طرف اشارہ، جس کا عنوان ہے 'صبح آزادی'، اگست ۱۹۴۷ء ؎
یہ داغ داغ اُجالا یہ شب گزیدہ سحر - وہ انتظار تھا جس کا یہ وہ سحر تو نہیں

pressure) بھی دیکھا۔ غرضکہ مکمل معائنہ ہوا تفصیلی رپورٹ تو بعد میں آئے گی۔ لیکن ان کا خیال ہے کہ ۱۹۴۹ میں جو نقصان پہنچ گیا اس کا کوئی علاج نہیں۔ انھوں نے بھی وہی باتیں بتائیں جو اس سے پہلے بھائی صاحب بتا چکے ہیں۔ کوئی strain (اسٹرین) نہیں ہونا چاہیئے وغیرہ وغیرہ۔

کل کی رات بہت حسین رات تھی۔ چاندنی سارے صحن میں چھٹکی ہوئی تھی اور ہمیں جتنا حصہ آسمان کا اپنی سیل (cell) میں سے نظر آرہا تھا نور میں دُھلا ہوا معلوم دے رہا تھا۔ ہوا بھی چل رہی تھی اور ہم اپنی چارپائی پر دراز، پڑھنے کی کوشش کر رہے تھے۔ کچھ تو موسم مخل ہو رہا تھا پڑھنے میں اور کچھ کتاب خود اس حد تک اُکتا دینے والی تھی کہ بار بار طبیعت اُچاٹ ہو جاتی تھی۔ ایسی راتوں میں اکثر ہم لوگ clifton (کلفٹن) Air port (ایئر پورٹ) گئے ہیں۔ اور اگر کہیں نہیں جا سکے تو اپنے کسی دوست کے ساتھ سڑکوں پر مارے مارے پھرتے رہے۔ اور مجھے بے ساختہ وہ سب لوگ اور وہ سب جگہیں یاد آگئیں۔

خیر جی چھوڑو اں باتوں کو۔ ہمارے Ward (وارڈ) میں ایک بلی رہتی ہے۔ یوں تو سب ہی اس کی تھوڑی بہت خاطر کرتے ہیں

لیکن شکور صاحب کی جان اس پر نچھاور ہے۔ اس کے کھانے کا انہیں بہت خیال رہتا ہے۔ کوئی دو ہفتہ ہوئے اس نے پانچ بچے دیئے شکور صاحب کہتے ہیں عام طور پر یہ نہیں ہوتا۔ اب اس دن سے اس کی اور بھی خاطر ہونے لگی ہے۔ بلّی اور بچے تندرست ہیں لیکن اب مسئلہ یہ ہے کہ اگر یہ سب یہیں رہ گئے تو کیا ہم کھائیں گے اور کیا ان کو کھلائیں گے۔

اپنی عید اور بقرعید ابکی خوب گزری۔ نماز زندگی میں اب کی پہلی مرتبہ نہ پڑھ سکے۔ اور پڑھتے بھی کیسے۔ اُٹھ آدمیوں میں تو عید بقر عید کی نماز نہیں پڑھی جاسکتی۔ یہاں اس کی اجازت نہیں تھی کہ ہم عام قیدیوں کے ساتھ جاکر نماز پڑھ سکیں۔ عید پر جیل کے عملے کی طرف سے Recording (ریکارڈنگ) ہوتی رہی لیکن بقرعید میں یہ بھی نہ ہوا۔ اور میں تو کہتا ہوں اچھا ہوا۔ دن بھر نہ جانے کس کس مسلم کے ریکارڈ بجتے رہتے۔ مجھے یہ فلمی دھنیں کچھ زیادہ پسند نہیں۔ تم سب لوگ بقرعید کے روز شدّت سے یاد آئے۔ لیکن چلو یہ بھی ایک تجربہ تھا زندگی رہی اور حکام کی مرضی ہوئی تو انشاءاللہ عید بقرعید ساتھ ہی منائیں گے۔

سرور اچھے ہیں۔ اماں کیسی ہیں۔ ان کی اور آپا کی خدمت میں

سلام عرض کرنا اور بھئی ان سے کہنا کہ پریشان نہ ہوں اور نہ کسی بات کی فکر کریں۔ راشدہ وغیرہ کو پیار۔ اور پرسان حال سے سلام کہہ دینا۔

اختر

۱۵۔ستمبر

پیاری آپا! تسلیم

اس دن آپ لوگوں سے جب مل کر آیا تو بہت سی فضول باتیں یاد آئیں جو آپ سے کرنے کا ارادہ کر کے گیا تھا۔لیکن وہاں جا کر سب بھول گیا۔ ایک تو ملاقات کا وقت اس قدر کم ہوتا ہے۔ دوسرے وہاں کی فضا ایسی ہوتی ہے۔ جلدی جلدی۔ اتنے لوگ انتظار کرتے ہوتے ہیں کہ اچھا بھی نہیں لگتا کہ دوسروں کو انتظار کرایا جائے۔ خیر باہر آ کر ایک روز جی بھر کر باتیں کروں گا۔ بالکل اسی طرح سے جیسے آپ الہ آباد آتی تھیں کافی عرصہ کے بعد تو رات بھر باتیں ہوتی تھیں۔ گپ شپ۔

ارشاد کا خط میں نے واپس آ کر غور سے پڑھا۔ بھئی یہ لونڈا خاصی معقول انگریزی لکھتا ہے۔ اس کی عمر ہی کیا ہے۔ ایسا بامحاورہ خط

کم از کم میں تو جب اس کی عمر کا تھا، تو ہرگز نہیں لکھ سکتا تھا۔ ویسے ہمیشہ اسکول اور کالج میں ہمیں انگریزی میں اچھے نمبر ملتے رہے۔ ہاں تو ارشاد صاحب نے اپنی کرکٹ (Cricket) کی ڈینگ ماری ہے۔ اسلام کا میچ (match) کب ہوا۔ غالباً بارش کی وجہ سے نہ ہوا ہوگا۔ میں اخبار میں دیکھ لیتا ہوں کہ شاید ان کے میچ کا تذکرہ ہو۔

تو مکان آپ بالکل نئے سرے سے بنوا رہی ہیں؟۔ آکر دیکھیں گے۔ اچھا ہی بنے گا جب آپ بنوا رہی ہیں۔ گیتی اور شیریں نے اپنے لئے کمرے ابھی سے ریزرو (reserve) کر لئے ہوں گے۔

اس وقت غالباً بارہ بجے ہوں گے۔ موسم بہت اچھا ہے آسمان ابر آلود ہے۔ باہر کچھ لوگ ring (رنگ) کھیل رہے ہیں۔ پڑوس کی بیرک (barrack) میں کوئی صاحب اپنی بھینگم آواز میں حفیظ جالندھری صاحب نے جو قومی ترانہ لکھا ہے وہ گا رہے ہیں۔ گا کم رہے ہیں اور شور زیادہ مچا رہے ہیں۔ آپ کے یہاں اس وقت رکارڈنگ (recording) ہو رہی ہوگی شیریں ریڈیو سے قریب ترین صوفے پر بیٹھی ہوگی۔ پتہ نہیں کون گا رہا ہوگا۔

آپ کو معلوم کر کے خوشی ہوگی کہ میں اب فجر کی نماز کے وقت اُٹھ بیٹھتا ہوں۔ تھوڑی دیر بعد اپنی کوٹھڑی کے کواڑ کھل جاتے ہیں۔ سرور

صاحب یہاں بھی ویسے ہی دیر تک سوتے رہتے ہیں۔ سب کے بعد نہاتے ہیں۔ ان کے لئے ارشاد اور اسلام کو اپنے سارے ساز و سامان کو جن کی مدد سے وہ لوگ انھیں اٹھاتے تھے تیار رہنا چاہیئے۔

شکور صاحب یہاں سے جا چکے ہیں۔ جاتے وقت وہ اپنی پانچ بلّیوں میں سے، جن کا ذکر میں اپنے پچھلے خطوں میں کر چکا ہوں، دو کو ساتھ لے گئے ہیں۔ بلّی اور ان کے بچوں سے ان کی دلچسپی عشق کی حد تک تھی۔ اب یہ تین بچے اور ان کی ماں یہاں ہیں اور ہم ان کا خیال رکھتے ہیں۔ جس دن سے شکور گئے ہیں بلّی کچھ غمگین رہتی ہے۔

اچھا دیکھئے آبا سے کہیئے کہ وہ ایک خط Chief Commissior (چیف کمشنر صاحب) کو لکھیں جس میں حکومت سے گزارہ الاؤنس مانگیں۔ اس میں میری تنخواہ کا ذکر کریں، جو مجھے گرفتار ہونے تک ملتی تھی۔ پانچ سو روپے ماہانہ۔ میں نے چاہا تھا کہ میں یہاں سے درخواست لکھ دوں لیکن اجازت نہیں ملی۔ بہرصورت گھر کے خرچ کے لئے ان کو کم سے کم چار سو (۴۰۰) روپوں کی ضرورت تو ہوگی۔

اور کیا لکھوں وقت گزر رہا ہے۔ ساڑھے تین مہینہ تو ہو گئے اور پتہ نہیں ابھی ایسے کتنے دن یہاں رہنا ہے۔ بہرحال وقت گزرتے

دیر نہیں لگتی۔ اور پھر مرگِ انبوہ جشنے دارد والا مضمون ہے۔

بچوں کو دعائیں۔ بھائی صاحب کی خدمت میں آداب قبول ہو۔ دیگر پُرسانِ حال سے بھی سلام کہہ دیجئے گا۔

شاہدہ، جو کتاب ۲ ستمبر کو دے گئی تھی وہ مجھے مل گئی ہے۔ فی الحال مجھے کسی کتاب کی ضرورت نہیں ہے۔

اختر

۲۰-اکتوبر ۵۴ء

شاہدہ وسعیدہ! دعائیں

آج معلوم نہیں کیوں پڑھنے کو جی نہیں چاہ رہا ہے۔ سوچا کہ لاؤ تم لوگوں سے ہی باتیں کی جائیں۔ ویسے یہ خط منگل کو جائے گا۔ میں اگر صبح کا انتظار کرتا تو قلم سے خط لکھ سکتا کیونکہ قلم سرور کے cell. (سیل) میں ہے۔ آخر کچھ نہ کچھ تو کرنا ہی تھا اس لئے صبح کا انتظار کون کرے۔

اس وقت عشار کی آذان ہو رہی ہے۔ یہاں جیل کے قریب ہی کوئی مسجد ہے جہاں مؤذن صاحب مائکروفون microphone پر آذان دیتے ہیں۔ اس وقت تو خیر چنداں مضائقہ نہیں۔ لیکن یہ بزرگ صبح بہت جلد اُٹھا دیتے ہیں۔ اس وقت یونہی سناٹا رہتا ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کوئی ہمارے سر پر ہی اذان دے رہا ہے۔

آنکھ کھُل جانی یقینی ہے۔ ان کی آواز اتنی کرخت ہے کہ الامان والحفیظ حضرت بلال جیسی آواز ہوتی تو کوئی بات نہ تھی۔ لیکن یہیں ان کی آواز اور پھر مائکروفون، سونے پر سہاگہ۔ لیکن چلو اس بہانہ سے بہت سویرے اُٹھ بیٹھتے ہیں اور پھر اس کے کوئی ۴۰ یا ۴۵ منٹ بعد ہمارے cell (سیل) بھی کھُل جاتے ہیں۔ یہاں کی صبح بہت حسین ہوتی ہے۔ باہر اس سے بھی بہتر ہوتی ہوگی لیکن ہم نے صبح ہوتے تو ادھر تین چار سال میں یہیں دیکھی اور اس کے لئے میں مؤذن صاحب کا شکر گزار ہوں۔

cell (سیل) کا دروازہ کھلتے ہی باہر آجاتا ہوں اور بیساختہ اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتا ہوں۔ اور پھر جناب انیس صاحب اپنی cell. (سیل) سے باہر تشریف لے آتے ہیں، منغمے ہر سُو بکھیرتے ہوئے اور اسی وقت ہم دونوں ایک ایک سگرٹ پی جاتے ہیں۔ تھوڑی دیر میں سب ہی باہر آجاتے ہیں۔ سرور بھی۔ صبح کا ضروری پروگرام ختم کرنے کے بعد نہا دھو کر یار لوگ ساڑھے آٹھ نو بجے تک ناشتہ کرتے ہیں۔ عام طور سے ناشتہ ایک سا ہوتا ہے لیکن کم از کم ہفتہ میں دو دن انیس صاحب اپنی جدت طبع دکھاتے ہیں اور ہم فرنچ ٹوسٹ (french toast) کھاتے ہیں۔ چائے پیتے ہیں اور

نہایت اطمینان سے گپ ہانکتے ہیں۔ اتنے میں اخبارات آجاتے ہیں اور پھر کوئی دو گھنٹہ اس میں گزر جاتے ہیں۔ آجکل شام کو بہت جلد بند ہو جاتے ہیں۔ چھ یا سوا چھ بجے۔ کیونکہ یہاں وقت کا تعین گھڑی سے نہیں ہوتا بلکہ طلوع و غروب سے ہوتا ہے۔ اور اس کے بعد رات ہماری ہوتی ہے۔ تین یا چار گھنٹہ پڑھائی ہو جاتی ہے۔ پھر نیند آگئی تو سو گئے اور نہیں تو بارہ بجا دیئے۔ راتیں بھاری ہوتی ہیں۔ ظاہر ہے کہ پہلے کبھی اس طرح تو رہے نہیں۔ بہرصورت اب تو عادی ہو گئے ہیں۔

آج ہماری بیرک سے دو صاحبان کو پڑوس والی بیرک میں تبدیل کر دیا گیا۔ اور ان کی جگہ دوسرے دو صاحبان تشریف لے آئے ایک تو ملک نورانی ہیں اور دوسرے یہاں کی کارپوریشن کے ایک ممبر ہیں سرور کو بھی ادھر بھیجنا چاہتے ہیں لیکن آج تو وہ یہیں رہیں گے۔ معلوم ہوا ہے کہ (B) بی کلاس والوں کو ایک جگہ رکھ رہے ہیں۔

سرور نے لکھا ہے کہ چونکہ ان کو شروع ہی سے بی (B) کلاس ملی ہوئی ہے اس لئے ان کا کلاس (class) ان سے یوں نہ لیا جائے۔ اگر بی کلاس (B. class) کا کرائی ٹیریا (criteria) یہ ہے کہ گریجویٹ ہو تو سرور تو ماشاء اللہ ڈاکٹر ہیں اور اس لئے ان

کوبی ( ) کلاس سے ہٹانا کچھ مناسب بات نہیں معلوم ہوتی۔ ویسے جیل کے حکام جو جی چاہے وہ کریں۔

میں آجکل گرے (Gray ۔) کی کتاب پڑھ رہا ہوں۔ کل ہی شروع کی ہے۔ انشاء اللہ منگل تک ختم ہو جائے گی۔ اس سے پہلے میں نے اسٹڈہال (Stendhal) کی Scarlet and Black (بلیک اینڈ اسکارلٹ) ختم کی ہے۔ بھئی مجھے یہ ناول بہت پسند آیا۔ شاید تم یہ ناول ضرور پڑھنا۔ گرے (Gray) کی کتاب ختم کرنے کے بعد میرا ارادہ ہے کہ گبن (Gibbon) کی Declin and Fall of Roman Empire سلطنت روما کا زوال اور اختتام) شروع کر دوں۔ ویسے یہ کتاب بہت ہی تندرست دتوانا نظر آتی ہے۔ لیکن یہاں میں نے چونکہ کئی ایسی تندرست کتابیں ختم کر دیں اس لئے اب ڈر نہیں لگتا۔ کوئی دو ہفتہ ہوئے ایک صاحب کی Churchill's memoirs (چرچل کی یادداشت) کا دوسرا اور تیسرا حصہ ختم کر چکا ہوں۔ جی چاہتا ہے اگر کہیں سے چوتھا اور پانچواں حصہ مل جائے تو اسے بھی پڑھ لوں۔

اور کیا لکھوں۔ پانچ مہینے تو ختم ہو ہی چکے ہیں۔ دیکھو وقت کیسی تیزی سے گزر جاتا ہے۔ اب بقیہ مہینے بھی ایسے ہی گزر جائینگے۔

سعیدہ! تم نے لکھا تھا کہ ہاروں بھائی کی شادی کے لئے ان کی اماں بہت زور دے رہی ہیں۔ تم میری طرف سے ان سے کہہ دینا کہ ان کے گلے میں جلد ہی پٹہ ڈال دیں۔ کب تک یونہی یہ آوارہ گردی کرتے رہیں گے۔ بھئی ہمارا سلام ہارون اور ان کی والدہ سے کہہ دینا۔

یہ خط اب چل نہیں رہا ہے۔ اس لئے اب اجازت دو۔ ابا اور اماں کی خدمت میں سلام عرض کرنا۔ راشدہ عذرا اور تم لوگوں کو بہت بہت پیار۔

اور ہاں سعیدہ تمھاری شرارتوں کے متعلق ہمیں شاہدہ کا خط مل گیا ہے۔ اماں کو پریشان مت کیا کرو اور محنت کر کے ڈھنگ سے پڑھا کرو! گیتی کا بہت دلچسپ خط آیا ہے۔ اس کو اگلے ہفتہ لکھوں گا۔ اس مرتبہ میں نے ایک خط ماموں کو لکھ دیا ہے۔

اختر

۲۴- اکتوبر

شاہدہ وسعیدہ! دعائیں

اس وقت چھ بج کر ۴۵ منٹ ہو رہے ہیں اور ہم ابھی ابھی اپنی cell (سیل) میں بند ہوئے ہیں۔ ویسے تو آج کل ہم لوگ چھ ہی بجے بند ہو جاتے ہیں۔ لیکن اسے آج ہماری خوش قسمتی یا بدقسمتی پر محمول کرو کہ ہماری طرف پانی ہی نہیں آیا۔ اور کوئی پانچ یا دس منٹ پہلے ہم لوگ کھانا کھا سکے۔ کیونکہ بڑی مشکلوں سے اڑوس پڑوس سے پانی منگوا کر کھانا تیار کرایا گیا۔ بہرصورت اسی بہانے اتنی دیر تک باہر ٹہلنے کو مل گیا۔ باہر بڑی خوشگوار ہوا چل رہی تھی۔ مغرب میں آسمان بالکل سُرخ ہو رہا تھا۔ میں نے عرصہ کے بعد سورج کو غروب ہوتے دیکھا اور مجھے بیساختہ باہر کی دنیا یاد آگئی۔ عام طور پر ہم لوگ مغرب کی آذان کے وقت ہی بند ہو جاتے ہیں اور شروع

کے تیس منٹ کوٹھری میں کچھ عجیب سے گزرتے ہیں۔ پھر پڑھائی شروع ہو جاتی ہے۔ گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ بعد جو نظر اٹھا کر دیکھتے ہیں تو باہر بالکل سناٹا اور اگر چاندنی نہ ہو تو اس قدر تاریکی کہ وحشت ہونے لگتی ہے۔ لیکن اب ہم عادی سے ہو گئے ہیں۔ ورنہ شروع میں تو اکثر راتوں کو سخت کوفت ہوتی تھی۔

دن میں آج کل دھوپ بہت جلد cell (سیل) میں آجاتی ہے اور تین بجے تک تو ہمہ کوٹھری آفتاب۔ ایک کونے پر چارپائی رکھی جائے تو بچت رہتی ہے۔ میں نے اب اسی کونے پر مستقل چارپائی بچھا رکھی ہے۔ کیونکہ کچھ اور حضرات ہیں جو دن میں دھوپ سے بچنے کے لئے بنوٹ اور گتکا کھیلتے رہتے ہیں۔ پھر بھی دھوپ کی زد میں آہی جاتے ہیں۔

اس وقت انیس صاحب مجاز کی مشہور نظم "آوارہ" لہک لہک کر پڑھ رہے ہیں۔ ایک تو اتنی پیاری نظم اور اس پر انیس صاحب جیسا خوش گلو۔ ایک سماں سا باندھ دیا ہے انھوں نے۔ اور مجھے اپنی آوارہ گردیاں یاد آرہی ہیں۔

مجاز کی نظم کا تذکرہ کرتے ہوئے مجھے مجاز کی ساری شخصیت یاد آگئی۔ پتہ نہیں اب کیا حال ہے ان کا ورنہ ایک زمانہ میں تو انھوں نے دھوم مچا رکھی تھی۔ مسلم بورڈنگ کے مشاعرے میں ہمیشہ بڑی پابندی

سے شریک ہوتے تھے۔ ۱۹۴۸ میں میرے ساتھ انھوں نے ایکٹوٹی (activity) فرمادی۔ ہوا یہ کہ میں اتفاق سے لکھنؤ گیا ہوا تھا۔ وہیں مجھے مجن نے جو اس سال مسلم بورڈنگ کے سکرٹری تھے بتا دیا کہ "فلاں روز مشاعرہ ہے اور تم مجاز کو سیکنڈ کلاس کا کرایہ دے کر بھیج دو۔ باقی روپے بعد میں بھیج دیں گے۔"

میری مجاز سے کوئی ملاقات نہ تھی۔ لیکن ان سے ملنا کچھ مشکل بھی نہ تھا۔ چنانچہ میں نے ان سے مل کر کہا۔ کہنے لگے "آپ کب جا رہے ہیں" میں نے کہا "میں تو غالباً آج شام کو چلا جاؤں گا۔ آپ چاہیں تو میرے ساتھ چلئے۔" کہنے لگے "نہیں، مجھے فی الحال کوئی ۶۰ یا ۷۰ (ساٹھ یا ستر) روپے دے دو میں مشاعرے کے دن ہی آؤں گا۔" میں نے روپے دے دیئے اور الہ آباد پہنچ کر مجن سے سب کچھ بتا دیا۔ اب مشاعرے کے دن ان کا انتظار ہوتا رہا اور یہ حضرت تشریف نہ لائے۔ بعد میں معلوم ہوا کہ ان روپوں کی تو وہ شراب پی گئے اور ایسے مدہوش ہوئے کہ الہ آباد آنا ہی بھول گئے بعد میں معذرت کا خط لکھا اور روپے واپس کرنے کی پیش کش کی۔ لیکن مجن نے کہا "جانے بھی دیجئے ایسی کوئی بڑی رقم کا سوال نہیں ہے۔ میں اپنے پاس سے دے دوں گا۔"

میں نے Stendhal (سینڈہال) کی اسکارلٹ اینڈ بلیک

Scarlet and Black) ناول کئی روز ہوئے ختم کر لی ہے
بہت اچھا ناول ہے۔ تمہیں اگر وقت مل سکے تو ضرور پڑھنا۔ اس وقت
تو سرور اسے پڑھ رہے ہیں۔ اور میں Development of
Economic Doctrine by Gray (معاشیاتی نقطۂ نظر کا
ارتقا) مصنفہ گرے پڑھ رہا ہوں۔ انشاء اللہ تین یا چار روز میں ختم ہو
جائے گی۔

شاہدہ! میں نے یہاں چرچل کی Second World War
(دوسری عالمی جنگ) کا دوسرا اور تیسرا حصہ پڑھ لیا ہے۔ بہت دلچسپ
کتاب ہے۔ اگر کہیں سے چوتھی اور پانچویں جلد مل جائے تو یہ بھی ایک
کام ہو جائے British Council (برٹش کاؤنسل) میں یہ کتاب
ضرور ہوگی۔ اگر تمہاری کوئی دوست وہاں کی ممبر ہوں تو ان سے کہو یا
میرے کسی دوست سے کہو۔ کتابیں میں برابر واپس کر دیتا ہوں۔ بعض
کتابیں زیادہ دنوں تک رہ جاتی ہیں۔ کیونکہ اور لوگ بھی پڑھتے
ہیں۔ اُمید ہے ہر کتاب ٹھیک ٹھیک واپس ہو جاتی ہوگی۔ ایسا نہ
ہو کہ جس کی کتاب ہے اسے ملے ہی نہیں۔

جمعرات کو ہمیں بتایا گیا کہ نئے قوانین کا نفاذ شروع ہو گیا
ہے۔ چنانچہ صرف چھ حضرات کو (ان میں سے ایک میں بھی ہوں)۔

سیکیورٹی بی کلاس (Security B. class) دیا گیا ہے۔ مجھ کو جیسے ہی میں ۳۰ روپے الاؤنس (allowance) ملیں گے۔ کھانا بھی اب پہلے سے بہتر ہو گیا ہے۔ سرور جن کو اب تک بی کلاس ملا ہوا تھا اب اوروں کے زمرے میں شامل کر دیئے گئے ہیں۔ اور ان لوگوں کو ۲۰ روپے مہینہ الاؤنس ملیں گے۔ فیملی الاؤنس (

) کا کچھ پتہ نہیں۔ میں ایک درخواست بھیج رہا ہوں۔ غالباً کل صبح لکھوں گا۔ رہا یہاں کے الاؤنس کا سوال وہ اس مہینہ میں شاید ہمارے اکاؤنٹ (account) میں جمع نہیں ہوا۔ ایسا معلوم دیتا ہے اگلے مہینہ سے شروع ہو گا۔ چلو پانچ مہینوں کے بعد کچھ تو ہوا۔ ویسے یہ قوانین تو اچھے ہیں بشرطیکہ ان پر پوری طرح سے عمل درآمد ہو۔

گزشتہ ہفتہ سعیدہ نے بتایا تھا کہ وہ ہمارے جو چیتے دوست ہیں ان کی شادی کے لئے ان کی والدہ بہت زور دے رہی ہیں۔ اگر ان سے ملاقات ہو تو میرا سلام کہنا اور میری طرف سے کہہ دینا کہ ان کی شادی ضرور کر دیں تاکہ ان کی آوارہ گردی ختم ہو جائے۔ ویسے میں آجاؤں تو اچھا ہے۔ لیکن اگر مجھے یہاں زیادہ دن رہنا پڑے تو میری عدم موجودگی ہی میں ہو جانا چاہیئے۔ کوئی مضائقہ نہیں۔ میں

ایک سہرا یہاں کسی سے لکھوا کر روانہ کر دوں گا۔

سرور اور تین صاحبان اب پڑوس کی barrack (بیرک) میں چلے گئے ہیں۔ ان لوگوں کے جانے کی وجہ سے بڑا سُونا سُونا سا لگ رہا ہے۔ بہرحال شام کو روزانہ ملاقات ہوتی ہے اور دن میں کبھی کبھی سرور کے قہقہے۔ یہاں بھی سُنائی دیتے ہیں۔

پرسوں تو تم لوگوں سے ملاقات ہو ہی جائے گی۔ یہ خط تو غالباً بُدھ یا جمعرات کو ملے گا۔ اور کیا لکھوں۔ آماں اور ابا سے سلام کہدینا راشدہ عذرا اور اس "منّو" کو دعائیں جو ہماری رہائی کیلئے دعائیں مانگتا ہے۔

گیتی کا بہت ہی دلچسپ خط تین روز ہوئے ملا۔ تمہارا خط سرور کے نام جو آیا تھا پرسوں ملا۔ اچھا بھئی اب اجازت دو۔

ہاں سعیدہ! وہ پوسٹ کارڈ جس میں تمہاری شکایت کی گئی تھی مل گیا ہے۔ اب تم ہی بتاؤ اس کے علاوہ تمہیں اور کیا کہہ سکتا ہوں کہ بھئی آماں کو تنگ مت کیا کرو اور اپنی پڑھائی کا خیال رکھو، اور اچھے نمبروں سے کامیاب ہو۔

دعاگو

اختر

منّو، راشد، مرحوم کی منجھلی بہن کا چھوٹا بچہ۔

۳ر دسمبر

شاہدہ ! دعائیں

۱۴- نومبر کو ایک خط تمہیں لکھ چکا ہوں۔ اگر تمہیں اب تک نہ ملا ہو تو اس میں میرا کیا قصور ہے۔ اب خطوط ملنے میں اس لئے دیر ہو جاتی ہے کہ- censor (سنسر) ہونے کے بعد وہ سی آئی ڈی (C. I. D) کے ہیڈ کوارٹر کو روانہ کر دیتے جاتے ہیں اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہاں کچھ تاخیر ہو جاتی ہے۔ بہر حال کوئی تشویش کی بات نہیں۔ کیونکہ ملاقات تو ہو ہی جاتی ہے۔

لیکن تمہاری یہ کیا حرکت ہے کہ ۵ر نومبر کے بعد صرف ایک پوسٹ کارڈ تم نے لکھا۔ سعیدہ کا خط ہمیں نہیں ملا۔ پتہ نہیں کہیں اِدھر اُدھر ہو گیا ہو گا۔ ہو سکتا ہے جسے ڈاک میں ڈالنے کے لئے دیا ہو اس نے سپرد ڈاک ہی نہ کیا ہو اور جیب ہی میں رہ گیا ہو۔

میں خط ہمیشہ مغرب کے بعد ہی لکھتا ہوں کیونکہ دن میں ایک تو mood (موڈ) نہیں ہوتا اور پھر اخبارات، برج اور گپ شپ سے فرصت ہی نہیں ملتی۔ آج کل میں برج کافی کھیلتا ہوں۔ کم از کم چار ربر (rubber)۔ پہلے اتنی دلچسپی نہیں تھی، لیکن ادھر کوئی پندرہ روز سے بڑی پابندی سے کھیلتا ہوں اور تمہیں یہ سُنکر خوشی ہوگی کہ آج ایک ربر (rubber) میں پندرہ پوائنٹ point بنائے۔ میرے پارٹنر (partner) ایک طالب علم، نسیم صاحب تھے۔ دوسری طرف ایک میڈیکل اسٹوڈنٹ medical student غالب صاحب اور ایک صاحب جن کا نام مارشل ہے۔ ہم چار آدمی زیادہ کھیلتے ہیں۔ خیال ہے اگر یہی حال رہا تو Bridge برج ٹورنامنٹ tournament میں شریک ہوں گے۔ برج کھیلنے سے یہ فائدہ ہوا کہ دن میں علاوہ اخبارات کے اور ساری پڑھائی ترک کر دی ہے۔ کیونکہ زیادہ پڑھنے سے بوریت ہوتی تھی ایک صاحب نے تو ایک دن مجھ سے بڑی سنجیدگی سے کہا کہ ہم اور تم اگر یونہی پڑھتے رہے تو باہر جانے کے بعد سِنک (cynic) ہو جائیں گے۔ وہ حضرت بھی کوئی چھ یا سات گھنٹے پڑھتے تھے۔ میں نے ان کی رائے سے قطعی اتفاق کیا اور فوراً برج کا پروگرام شروع

کر دیا۔ رات میں چار گھنٹے کافی ہوتے ہیں پڑھنے کے لئے۔

تمہیں ایک افسوسناک خبر سُنائیں۔ ہمارے پاس تین بلّی کے بچے تھے ان میں سے دو انتقال کر گئے کوئی پانچ ماہ کے رہے ہوں گے۔ بڑے کھلنڈرے اور شریر تھے پتہ نہیں کیا ہوا۔ تین چار روز کی بیماری کے بعد اللہ کو پیارے ہو گئے۔ اپنی بیرک (barrack) بڑی سونی ہو گئی ہے۔ ان کی وجہ سے ایک ہنگامہ برپا رہتا تھا۔ اب ایک بچّہ رہ گیا ہے اور اس کی ماں ہے۔ وہ دونوں خدا کے فضل و کرم سے بالکل ٹھیک ہیں۔

ناشتہ آج کل ہم لوگ کوئی نو بجے کرتے ہیں۔ کیوں کہ نہانے میں لوگ دُھوپ کا انتظار کرتے ہیں۔ کچھ لوگ dry cleaning (ڈرائی کلیننگ) پر ہی اکتفا کرتے ہیں۔

کتابیں فی الحال تو ہیں۔ لیکن ہفتہ عشرہ کے بعد ضرورت پڑے گی۔ عرصہ ہوا میں نے ہیری ہوپکنز (Harry Hopkins) کی کتاب کے متعلق لکھا تھا۔ اگر کہیں سے دستیاب ہو سکے تو ضرور لے آؤ۔ چرچل نے اپنی (یادداشتیں) memoirs میں مرحوم ہوپکنز (Hopkins) کی اس قدر تعریف کی ہے کہ جی چاہتا ہے کہ اس عجیب و غریب شخصیت کی کتاب ضرور پڑھی جائے۔ ہوپکنز (Hopkins) دوران جنگ میں روزویلٹ کی

Roosevelt) کے دستِ راست تھے۔

اچھا بھئی اب اجازت دو۔ میں اس وقت گیتی کو خط لکھنے کا ارادہ کر رہا ہوں۔ سرور نے تمہیں گزشتہ ہفتہ ایک خط روانہ کیا ہے۔ اُمید ہے ملا ہوگا۔ سعیدہ راشدہ کو دعائیں اور پیار۔ عذری کیسی ہے اس کو، ارشد اور ظفر کو بہت بہت پیار۔ آبا اور اماں کی خدمت میں سلام عرض ہے۔

اختر

کراچی جیل

۲۳۔ دسمبر ۵۴ء

شاہدہ! دعائیں اور بہت سا پیار

اس سے قبل ۷۔ جولائی کو ایک خط تمھیں اور ایک گیتی کو روانہ کر چکا ہوں۔ اُمید ہے ملے ہوں گے۔ نہ ملے ہوں تو انتظار کرو جب سنسر ہو جائیں گے تو نادر ہاؤس میکلوڈ روڈ سے پیر الٰہی بخش کالونی پہنچ ہی جائیں گے۔ ویسے غصہ کرنے کا مجھے تو کوئی حق ہے نہیں کیونکہ مجھے فارسی کی یہ مثل یاد ہے قہر درویش بر جانِ درویش۔

یہاں کی دُنیا اب اُجڑتی جا رہی ہے۔ ہائے کیسی بہار تھی اب سے ایک ماہ پہلے۔ لیکن گزشتہ ماہ سے اس چمن میں ایسے خزاں کے جھونکے آ رہے ہیں کہ بس کچھ نہ پوچھو۔ کس کس کو روئیں۔ کیسے کیسے

حسین و خوبرو چلے گئے۔ بھئی یہ دُنیا ہے یہاں کا کاروبار ہی یہی ہے ایک آیا تو ایک گیا۔ اور ہاں پرسوں 'انیس' صاحب داغ مفارقت دے گئے۔ بس یہی شام کا وقت تھا، ہم لوگ باہر نکلے ہی تھے کہ پُرانہ راہ داری آگیا۔ اس دن ہماری cell (سیل) میں سفیدی ہوئی تھی۔ فرش دُھلے تھے اور ہماری cell (سیل) میں ایک نئی چمک تھی۔ میں نے انیس سے کہا کہ میاں آج ہی اتنی محنت کی ہے جیل والوں نے۔ اور تمہاری کوٹھری چاچم ہو رہی ہے۔ آج ہی تم نے چلنے پر کمر باندھ لی۔ خیر انھیں کسی نہ کسی طرح رخصت کیا۔ بالکل ویسے ہی جیسے دلہن کو لوگ رخصت کرتے ہیں۔ بقول انیس کے جھلوس (جلوس) اُٹھ گیا۔ سُرمہ لگایا، چہرہ پر پونڈز کریم لگائی گئی اور پھر انھیں لوگوں نے گلے سے لگایا اور "فی امان اللہ" کہا۔ اپنا باورچی خانہ اُجڑ گیا۔ شام کو بند ہوتے تھے تو غزلیں سنتے تھے۔ بس یہ سمجھو یہاں سے نغمگی رخصت ہو گئی۔ بہت گئے آگے باقی جو ہیں تیار بیٹھے ہیں والا مضمون ہے پتہ نہیں یہ مصرعہ ٹھیک بھی ہے یا نہیں۔ بات یہ ہے کہ مجھے آج تک صرف آٹھ یا دس شعر یاد ہو سکے ہیں اور وہ سب کے سب غالب کے ہیں۔

غالب کا جو تذکرہ آیا تو یاد آیا کہ ہمارے ساتھ ایک میڈیکل کالج کے طالب علم بھی ہیں۔ ان کا بھی یہی نام ہے اور انھیں سب چچا کہتے

ہیں۔ انھیں انیس کی کوٹھری میں بٹھا دیا گیا ہے۔ کیونکہ انیس کے بعد وہی ایک ایسے آدمی ہیں جو باورچی خانہ چلانے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ وہ بھی بہت خوش ہوئے کہ چلو کچھ اختیارات تو ملے۔ اب وہ سفید و سیاہ کے مالک ہیں۔ انھوں نے کام تو سنبھال لیا ہے اور میرا خیال ہے کہ وہ اپنی ذمہ داری کو نبھا دیں گے۔ ہاں تو انھیں سب ہی 'چچا' کہتے ہیں۔ یہاں تک کہ ۶۰ سال کے بوڑھے نرائن بیجر داس بھی۔ اور غالب صاحب کا (اندر) attitude ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ 'چچا' کہلانا اپنا پیدائشی حق سمجھتے ہیں۔

آج شام کو جب سرور سلمہ سے ملاقات ہوئی تو معلوم ہوا کہ حضرت صبح سے تیار تھے کہ آج شاید باہر جائیں۔ پرسوں ہی انھوں نے بال کٹوا لئے تھے اور مینج (شیو) کر کے انتظار کرتے رہے لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ معاملہ آئندہ کے لئے ٹل گیا۔

بھئی اب آئندہ کچھ کتابیں ضرور لیتی آنا کیونکہ پچھلا اسٹاک ختم ہو چکا ہے۔ چرچل صاحب کو ہم ختم کر چکے ہیں۔ تم نے کہا تھا کہ فسانۂ آزاد مل سکتی ہے تو لاؤ اُسے پڑھ ڈالیں۔ Hopkins (ہوپکنز) کی کتاب کے لئے بھی تمہاری یاد دہانی کرنا چاہتا ہوں۔ چرچل صاحب کے ہر olume (جلد) میں ان بزرگ کا تذکرہ ہے۔ اور کچھ اس

اندازہ سے ہے کہ مجھے اشتیاق ہے کہ ان کی کتاب پڑھ ہی ڈالوں
ایک زمانہ میں یہ کتاب Thomas and Thomas اور
Paramount Book Co. میں موجود تھی۔ پتہ نہیں اب ہے
کہ نہیں۔

اور سناؤ کیا حال ہیں۔ کالج تو بند ہوگا۔ تمھارے امتحانات
کب سے ہیں؟۔ بھئی محنت کر ڈالو! سعیدہ اور راشدہ کیسی ہیں؟ امید
ہے دونوں سارا وقت گپ شپ اور شرارتوں میں گزارتی ہونگی۔
عزیزم ہارون سلمہٗ کیسے ہیں۔ آج کل تو وہ بہت مصروف ہوں
گے۔ بڑا پیارا بچہ ہے۔ میری طرف سے دعا اور پیار کہہ دینا۔
نئے سال کی مبارکباد دے دوں کیوں کہ یہ خط تمہیں ۱۹۵۵
میں ملے گا۔ خدا کرے سب کے لئے مسرت ہی مسرت لے کر آئے۔
آئندہ ہفتہ سے ہندوستان کی کرکیٹ ٹیم کا دورہ شروع ہو رہا
ہے۔ بڑی خواہش تھی کہ اسے میں cover (کور) کروں اور یقین
تھا کہ باہر ہوتا تو کم از کم سارے ٹیسٹ (test) تو میں ہی کور
(cover) کرتا۔ اسپورٹس (sports) کی دنیا میں گزشتہ سات ماہ
سے بڑی رونق تھی اور آئندہ چار ماہ اور رہے گی۔
اچھا بھئی اجازت دو۔ اس وقت غالباً آٹھ بجے ہوں گے

بچوں کو پیار اور دعائیں۔ ابّا اماں کی خدمت میں سلام عرض ہے۔

اختر

۲۴- دسمبر ۱۹۵۴ء

شیریں! بھئی معاف کرنا۔ تمہیں بہت سرسری طور سے خط لکھ رہا ہوں۔ ارشاد صاحب کے کرکٹ نے کافی جگہ لے لی۔ کیا کروں عرصے سے کچھ لکھنے کو نہیں ملا تو تھوڑی سی کسر آج نکال لی۔

تو آج کل چھٹیاں ہیں۔ اپنی تو holiday (ہالی ڈے) کا ایک نہ ختم ہونے والا سلسلہ ہے۔ دن عید اور رات شب برات۔ کوئی کام نہیں سوائے گپ، برج اور پڑھنے کے۔ اور یہ پتہ نہیں کہ فورسڈ ہالی ڈے (forced holiday) کب ختم ہوگی۔ ویسے تو اب پانچ ماہ رہ گئے ہیں۔

پڑھائی کے متعلق کیا پوچھتی ہو۔ کافی ہو جاتی ہے۔ کتابوں اور رسالوں کی وجہ سے بوریت نہیں ہوتی۔ اس وقت تک مہینہ میں ۴

کتابوں کا اوسط (AUERAGE) ہے۔ اگر تمہیں کہیں سے شیروڈ Sherwood) کی روزویلٹ اور ہاپکنز (Roosevelt and Hopkins) مل سکے تو ضرور لاؤ۔ ویسے بلاوجہ زحمت اُٹھانے کی ضرورت نہیں ہے۔

اختر

کراچی جیل

یکم جنوری ۵۵ء

گیتی بٹیا! دعائیں

سال نو مبارک ہو۔ آج سارا دن موسم بہت خوشگوار رہا۔ بھئی ہم نے بھی نئے سال کو خوش آمدید کہا اور اس خوشی میں سب نے شام کی چائے ساتھ ہی پی اور جیل میں جیسی بھی چھوٹی موٹی تقریب ہو سکتی تھی منائی۔

ایک New year Honours list نئے سال کی آنرز لسٹ) بھی مرتب کی گئی۔ چند خطابات تو بہت ہی موزوں اور مناسب تھے۔ یہاں ایک صاحب ہیں "مسلم ضیائی"۔ شاعر بھی ہیں اور مترجم بھی۔ قد بوٹا سا اور چشمہ لگاتے ہیں۔ شام کو جب والی بال (Volley ball LLL) کھیلتے ہیں اور گیند باہر چلی جائے تو اس کو

پکڑنے کے لئے جب مسلم ضیائی صاحب چھوٹے موٹے انجن کی طرح بھاگتے ہیں تو کبھی کبھی دونوں میں امتیاز کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔ ان کو یار لوگوں نے Sporting Sam (اسپورٹنگ سیم) کے خطاب سے نوازا ہے۔ Sporting Sam تم ڈان میں دیکھتی ہو گی۔ بہر صورت مجھے پسند آیا کیونکہ ضیائی صاحب کو اُٹھاؤ اور Sporting Sam (اسپورٹنگ سیم) کو بٹھاؤ۔ جمال نقوی کو Honours list (رپ وان وِنکل) مجھے Col. Up (کرنل اپ) یہ بھی ڈان کا ایک کارٹون ہے۔ سرور کو Gambol, without Gaye (گیمبول وِدآؤٹ گے ئی) اور ایک صاحب کو، جن کی قابلیت کے سب ہی قائل ہیں اور جن کی خاموشی ایک اسرار ہے Pandora's box (پینڈورا کا بکس) کے نام سے نوازا گیا ہے Honours list (آنرز لسٹ) پڑھ کر سنائی گئی اور تالیوں کی گونج میں لوگوں نے اس کا خیر مقدم کیا۔ گانے کا پروگرام رہا اور چند اور (آئیٹمز) اور ہاں انیس ہاشمی اور ماکسار سال کے بہترین sportsman (اسپورٹس مین) چُنے گئے۔ ہم لوگ کل آپس ہی میں ایک Volley ball (والی بال) میچ بھی کھیل رہے ہیں۔ اُمید ہے میچ بہت دلچسپ ہو گا۔ افسوس ہے کہ کراچی کے لوگ اس کو نہ دیکھ پائیں گے۔ جیتنے

والی ٹیم کو Hashmi Memorial Khir (ہاشمی میموریل کھیر) کھلائی جائے گی۔

غرض کہ شام بہت اچھی گزری۔ دن میں اخبارات کے مطالعہ کے بعد برج کا پروگرام شروع ہوگیا۔ اور درمیان میں کوئی ایک گھنٹہ کے break (بریک) کے بعد پھر چار بجے تک، ہوتا رہا۔

میری طرف سے سب کو نئے سال کی مبارکباد دے دینا۔ میں نے چاہا کہ چند دوستوں کو بذریعہ تار greet کروں لیکن کل دفتر بند تھا اور آج ان کی بغیر اجازت کے یہ تار روانہ نہیں ہو سکتے تھے۔ کل اتوار ہے اور میں سوچتا ہوں کہ اگر اجازت مل بھی گئی تو اب بہت دیر ہو جائے گی۔

اس وقت غالباً سات بجے ہوں گے۔ آسمان ابر آلود ہے اور ہوا چل رہی ہے اور ایسے میں باہر کی دنیا یاد آ ہی جاتی ہے۔ لیکن ہم نے اپنے آپ کو adjust (عادی) کر لیا ہے۔ یہاں کی دنیا بھی ایک خاص دلکشی رکھتی ہے۔ شروع شروع میں تو تکلیف ہوتی ہے لیکن آخر کب تک۔ اور ایک مرتبہ انسان اپنے آپ کو حالات کے مطابق ڈھال لے تو وقت بڑے مزے سے گزر جاتا ہے۔ یہاں سے جب کوئی جاتا ہے تو دو ایک روز تک تو محسوس ہوتا ہے۔ لیکن پھر

وہی ہم اور وہی یہاں کی مانوس فضائیں اور زندگی اپنے ڈھرے پر لگ جاتی ہے۔

آج میرے پاس cigarette (سگرٹ) رات کے لئے شاید پورے نہ ہوں کیونکہ چند شام کی چائے کی نذر ہو گئے اور ہم بچا کھچا سرمایہ جو دوستوں کی دست برد سے بچ گیا تھا لئے بیٹھے ہیں۔ جی چاہ رہا ہے کہ ایک اور سلگائیں۔

لیکن اس خیال سے کہ ابھی رات بہت پڑی ہے نہیں جلا رہے ہیں۔

ہاں ابھی ابھی سرور کی ہنسی سنائی دی۔ بہت قریب ہیں یہ لوگ اور رات کے سناٹے میں وہاں سے آواز آ ہی جاتی ہے۔ پتہ نہیں کس کا مذاق اڑ رہا ہے۔

اور سناؤ کیا حال چال ہیں۔ بھئی کتابیں ختم ہو گئیں۔ آئندہ کے لئے چند معقول کتابیں ضرور روانہ کر دو۔ میرے پاس پڑھنے کو اور کچھ نہیں تھا تو Hutton (ہٹن) کی Cricket is My Life (کرکٹ آزمائی لائف) شروع کر دی۔

اور کیا لکھیں منگل کو ملاقات تو ہو گی۔ یہ ملاقات کا دن بھی خوب ہوتا ہے۔ معلوم ہے اس دن کا کس شدت سے انتظار کرتا ہوں۔ ہمارا

ہفتہ کو شروع ہی اِس دن سے ہوتا ہے۔ اِدھر تم لوگ گئیں اور اُدھر میں نے اگلے منگل کی آمد کا انتظار کرنا شروع کر دیا۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ سوائے انتظار کے اور کچھ کرتا ہی نہیں۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ منگل کی صبح کو بہت خوش ہوتا ہوں۔ جلدی جلدی تیار ہوتا ہوں اور پھر تم لوگوں سے ملنے کا اشتیاق رہتا ہے۔

ہاں سعیدہ سے کہنا کہ اسے میں پھر خط لکھوں گا۔ اس ہفتہ صرف تمہیں لکھ رہا ہوں۔ لفافہ ہی نہیں ہے۔ خط تو وہ ضرور ہو گی لیکن تم یہ خط بھیج دینا۔ آپا اور بھائی صاحب کی خدمت میں بہت بہت سلام عرض ہے۔ شیریں، اسلام، ارشاد اور بالو کو دعائیں۔

اختر

کراچی جیل

۱۴ر جنوری ۵۵ء

گیتی بیٹا! دعائیں

اس وقت صبح کے پانچ بجے ہیں۔ میں ابھی ابھی سو کر اُٹھا ہوں۔ فجر کی اذان نہیں ہوئی۔ پھیکی پھیکی چاندنی دروازہ کی سلاخوں سے چھن چھن کر میرے cell (سیل) میں آ رہی ہے۔ فضا پر ایک عجیب سا سناٹا طاری ہے۔ کبھی کبھی کتوں کے بھونکنے کی آواز آجاتی ہے۔ مرغانِ سحر بھی بانگ دے رہے ہیں۔

میرے پاس نہ تو مولانا آزاد کی طرح stove (اسٹوو) ہی موجود ہے نہ white jasmine tea (وہائٹ جیسمائن ٹی) ورنہ ممکن تھا اس وقت میں بھی چائے پی رہا ہوتا اور پھر چند لائنیں تمہیں چائے کی خوبیوں کے متعلق لکھتا۔ بغیر خاطر تواضع تم نے

پڑھی ہوگی۔ یہ مولانا آزاد نے احمد نگر فورٹ میں لکھی تھی۔ چائے کے متعلق انھوں نے جس والہانہ انداز میں لکھا ہے۔ اس کو پڑھ کر یہ خیال بھی ہوسکتا ہے کہ شاید انگور کی بیٹی کا تذکرہ ہو۔

ہاں تو میں اس وقت سگرٹ پی رہا ہوں۔ ابھی ابھی جلایا ہے۔ ایک دو کش ہی لئے ہوں گے کہ خیال آیا کہ اس وقت تمہیں خط کیوں نہ لکھا جائے۔ اب باہر سڑک پر ایک آوارہ بس کے غرّانے کی آواز آرہی ہے۔ قریب کی بیرک میں ایک صاحب قرآن شریف کی تلاوت کر رہے ہیں۔ چڑیوں نے ابھی چہچہانا شروع نہیں کیا۔ فی الحال تو مرغ اذان دے رہے ہیں۔

اس وقت cell (سیل) نمبر (۱) سے دھان کوٹنے کی سی آواز آرہی ہے۔ پریشان ہونے کی بات نہیں یہاں دھان کہاں۔ یہ صاحب cell (سیل) میں صبح کی کسرت کر رہے ہیں۔ یہ حضرت جب ہماری بیرک میں آئے اور ہم نے روزانہ اسی قسم کی آواز سُنی تو سخت متحیر ہوئے کہ یہ کیا ہوتا ہے۔ پتہ چلا کہ مولانا اپنی داہنی ٹانگ کی کسرت فرماتے ہیں۔ اس پر ایک کمبل لپیٹ لیتے ہیں اور اسے چارپائی پر پٹختے ہیں۔ دراصل ان کی ایک ٹانگ کچھ خراب ہے اور یہ دھما چوکڑی اس کی درستی کے لئے مچاتے ہیں۔

میں نے رات ایک ہلکی پھلکی سی کتاب جس کا نام ہے Some Aspects of Economic Development (سم اسپکٹس آف اکنامک ڈیولپمنٹ) پڑھنی شروع کی ہے۔ Economic (اکنامکس) میں اپنی دلچسپی کچھ واجبی ہی واجبی سی ہے۔ اس لئے باقاعدہ ہجے کر کے پڑھتا ہوں۔ گزشتہ دنوں میرے پاس ایسی ایک اور بڑی ثقیل سی second test (اکنامکس) پر کتاب تھی۔ میں اسے اس وقت پڑھتا تھا جب سونے کو جی چاہ رہا ہو اور نیند نہ آ رہی ہو۔ بس کوئی دس صفحے پڑھے اور نیند آ گئی۔ بھائی صاحب کو بتا دو کہ نیند کی گولیاں تشخیص کرنے کی بجائے مجھ سے دو ایک ایسی کتابوں کے نام پوچھ لیں۔ بڑی کارگر ثابت ہوں گی۔

(۱۴ جنوری بوقت ۷ بجے شام)

صبح خط ختم نہ ہو سکا کیونکہ لیمپ میں تیل ختم ہو گیا تھا۔ تیل اسی قدر ہوتا ہے کہ آپ زیادہ سے زیادہ چار گھنٹے جلا سکیں کبھی کبھی غلطی سے کچھ زیادہ بھی جل جاتا ہے۔

کل سے second test (دوسرا ٹسٹ) شروع ہو رہا ہے۔ باہر ہوتے تو نہ صرف دیکھتے بلکہ لکھتے اور دوسرے دن صفحۂ اوّل پر By M. Akhtar (از ایم۔ اختر) کوئی ایک یا ڈیڑھ کالم

کی story (اسٹوری) تم لوگ دیکھتیں۔ اور جناب پورے چار ماہ یہ سلسلہ جاری رہتا۔ لیکن اب کیا لکھوں۔ اچھا سنو ہم نے ارشاد کو ۲۴ر یا ۲۵ر دسمبر کو ایک خط لکھا تھا ملا کہ نہیں۔ پھر تمہیں بھی جنوری کے پہلے ہفتہ میں لکھ چکا ہوں لیکن تم دونوں نے کوئی نوٹس (notice) نہیں لیا۔ یاد رکھنا سخت گوشمالی کروں گا۔

ارے بھائی یہ معین صاحب کی شادی کا کیا ہوا۔ سُنا کچھ بات نہ بنی۔ اگر یہ صحیح ہے تو میری طرف سے انھیں مبارکباد دے دینا اور کہنا کہاں یہ دَر دَر سر پالتے ہیں۔ چلو بیچارے بال بال بچ گئے۔

اور سُناؤ کیا ٹھاٹھ ہیں۔ امید ہے گھر کی کھٹ پٹ سے نجات مل گئی ہوگی یا ابھی کچھ کام ہو رہا ہے؟ ادھر دو تین روز سے موسم خوشگوار ہے۔ مجھے سردی سے بہت پیار ہے۔ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا اور پھر اللہ میاں کنجوسی بھی نہیں کرتے۔ جھوموں اُوپر سے پھینکتے رہتے ہیں۔

سنو ایک کتاب Germinal (جرمینل) جسے ایمیلی زولا (Emile Zola) نے لکھا ہے الماری میں رکھی ہوگی۔ آئندہ کبھی تمہیں یاد رہے تو لیتی آنا۔ اس ناول کی تعریف میں نے بہت سُنی تھی اور اسی لئے خرید بھی لی تھی۔ لیکن پڑھ نہ سکا۔ اب فرصت ہی

ہی فرصت ہے۔

بھئی ہماری طرف سے ارشاد کو ایک اچھی سی چپت ہر ہفتہ لگایا کرو۔ ویسے یہ تو مجھے معلوم ہے کہ ڈرل ماسٹر اس کی مرمّت کرتا ہوگا اسلام سے کہو کچھ تو میرا خیال کرو۔ عجب نالائق ہے۔ بزرگوں کے قدر کا اسے کچھ خیال ہی نہیں۔ اور شیریں صاحبہ کیسی ہیں۔ بالو کو دعا کہنا۔ آپا اور بھائی صاحب کی خدمت میں سلام عرض ہے۔ تمہیں بہت بہت پیار اور دعائیں۔ سرور ٹھیک ہیں۔

اختر

کراچی سنٹرل جیل

۴۔ فروری ۵۵ء

شاہدہ دعائیں

تمہارا خط ملا۔ کرکٹ میچ کی تفصیلات دلچسپی سے پڑھیں۔ اخبارات سے بھی اندازہ ہوا کہ کھیل بہت اچھا ہوا۔ اس میچ کے تیسرے روز کوئی دو گھنٹہ کے لئے جیل کے ایڈمنسٹریٹر Administrator کی مہربانی سے کمنٹری بھی سُنی۔ ویسے کمنٹری بکواس تھی۔ کسی کو بھی ٹھیک سے بولنا نہیں آتا۔ یہ میچ ہماری ٹیم جیت سکتی تھی لیکن برا ہو بارش کا کہ اس نے ساری اُمیدوں پر پانی پھیر دیا۔ کاردار کی INNINGS (اننگسز) واقعی قابل دید رہی ہوں گی۔ میں نے تو میچ دیکھا نہیں لیکن اخبارات پڑھنے سے اندازہ ہوا کہ اتنی شاندار batting (بیٹنگ) کاردار نے پاکستان

میں پہلی مرتبہ کی۔ مجھے ۱۹۴۵ کا وہ دن یاد آتا ہے جب کاردار نے اتنی ہی شاندار batting (بیٹنگ) کلکتہ میں کی تھی۔ خیر تمہیں ظاہر ہے اس سے زیادہ دلچسپی نہ ہوگی لیکن میرے دل پر وہ میچ اب تک ثبت ہے۔

تمہیں شاید یہ نہ معلوم ہو کہ ہندوستان کی ٹیم میں Roy (رائے) نامی جو کھلاڑی ہے میں اس کے خلاف کھیل چکا ہوں۔ ہمارا میچ کلکتہ میں آج سے کوئی آٹھ نو سال پہلے inter-Versity (انٹر ورسٹی) ٹورنامنٹ میں ہوا تھا۔ Roy (رائے) کلکتہ یونیورسٹی کی طرف سے کھیلتا تھا اور لوگوں کا خیال تھا کہ دو ایک سال میں وہ ہندوستان کی جانب سے کھیلنے لگے گا۔

بھئی آج کوئی ساڑھے تین بجے ہماری بیرک سے ایک صاحب اور رہا ہو گئے۔ نسیم صاحب کی Habeus Corpus (ہیبس کارپس) منظور ہو گئی۔ تم لوگوں کو معلوم ہی ہوگا۔ بہت خوش تھا۔ میں اس وقت cell (سیل) میں لیٹا ہوا اخبار دیکھ رہا تھا کہ نسیم صاحب ایک دم سے آئے اور لپٹ گئے۔ معلوم ہوا رہائی کا حکم آگیا ہے۔ ہم سب بہت خوش ہوئے۔ اور اُسے رخصت کیا۔ ہماری برج پارٹی ٹوٹتے ٹوٹتے بچی اتفاق دیکھو آج صبح ہی شرف علی ہماری بیرک

میں آئے اور شام کو نسیم صاحب روانہ ہو گئے۔

بھئی یہ خط نہ ملنے کی شکایت عجیب ہے۔ میں نے گزشتہ مہینے دو خط لکھے ہیں۔ ان میں سے کم از کم ایک تو ملنا چاہیئے تھا۔ سرور نے بھی لکھا ہے۔ پتہ نہیں ان کا خط ملا کہ نہیں۔

آج کل تو گرمی پڑنے لگی ہے۔ بارش کی وجہ سے ایسی سردی نہیں ہوئی کہ لحاف کی ضرورت پڑتی۔ ویسے ابھی میرے پاس کمبل تو ہے۔

آج کل باغبانی کا شوق چرایا ہے۔ کیاریاں بنائی ہیں اور ایک میں 'ہالی ہاک' کے چھ پودے بھی لگا دیئے ہیں۔ چھوٹے چھوٹے ہیں۔ یہ pastime (پاس ٹائم) بہت ہی اچھا ہے۔ کیاریاں بنانا زمین کھودنا پانی دینا اور اس کے بعد پودے لگانا۔ کس قدر خوشی ہوتی ہے۔ ویسے ہمارے یہاں کھیتی باڑی تو ہمیشہ سے ہوتی آئی ہے لیکن ہم تو اس زندگی سے کوسوں دُور رہے۔ ہمارے ابا بھی کبھی اس زندگی کے قریب نہیں گئے۔ نتیجہ میں ہم بہت حد تک شہری ہو گئے لیکن یہ شوق اب ہوا جب میعاد قید و بند کو ختم ہونے میں ۳ ماہ باقی رہ گئے۔ پہلے سے کرنا چاہیئے تھا۔ اب موسم بہار شاید ایک ماہ اور رہے۔ پھر خزاں کا دور دورہ ہوگا۔ گرد و غبار ہوگی اور ہماری اُجاڑ بیرک۔ اسی اُجاڑپن

کو کم کہنے کے لئے ہم نے یہ کام شروع کیا ہے۔ تم بھی پھولوں کے کچھ بیج لانا۔

امید ہے تم اپنی پڑھائی کا خیال رکھتی ہوگی۔ تمھارا فائنل ہے خوب محنت کر کے پڑھ ڈالو کیونکہ امتحان اب قریب ہیں۔ آماں اور ابا کی خدمت میں سلام عرض کر دینا۔ راشدہ سعیدہ، عذرا، اور ارشد کو بہت بہت پیار۔

اختر

کراچی جیل

۱۳ر فروری ۵۵ء

شاہدہ دعائیں

گذشتہ ملاقات کے روز اماں نے کہا تھا کہ جس وقت ہم لوگ بند ہوتے ہیں وہ بہت ہی سہانا وقت ہوتا ہے۔ ظاہر ہے انھیں اس کا افسوس ہوگا لیکن واقعہ یہ ہے کہ اب مجھے اس سے ذرہ برابر تکلیف نہیں ہوتی۔ ویسے بھی باہر اس وقت عام طور سے دفتر میں ہوتا تھا۔ آج جب میں بند ہوا تو مجھے بیساختہ اماں کی بات یاد آگئی اور میں دروازہ سے لگ کر سورج کو ڈوبتے ہوئے دیکھنے لگا۔ اب میں اگر شاعری کی کوشش کروں تو یہ کہہ سکتا ہوں کہ آسمان تپے ہوئے تانبے کی طرح ہو رہا تھا اور چڑیاں چہچہا رہی تھیں وغیرہ وغیرہ۔ لیکن یہ واقعہ ہے کہ آسمان بے حد حسین ہوگیا تھا اور یہ ہمارا کمرہ جو ہے نا!

تو اس کا رُخ مغرب کی طرف ہے۔ بالکل مغرب کی طرف بھی نہیں لیکن جھکاؤ اس کا کچھ اسی طرف ہے چنانچہ ہم ہمیشہ ہی مغرب کے وقت یہ سماں دیکھتے ہیں۔

ہماری بیرک میں پھر آبادی کا اضافہ ہو گیا ہے۔ تمہیں یاد ہو گا۔ پچھلی گرمیوں میں میں نے لکھا تھا کہ یہاں ایک بلّی ہے جس نے پانچ بچے دیئے ہیں۔ اُسی نے اس مرتبہ پھر چار کا اضافہ کر دیا۔ ان میں سے دو تو شکور صاحب لے گئے تھے دو کا انتقال ہو گیا تھا، اور ایک یہاں ہے۔ اب ان محترمہ نے ہمیں مصیبت میں ڈال رکھا ہے۔ غسل خانے میں براجمان ہیں۔ وہاں انھیں ظاہر ہے آرام نہیں ملتا چنانچہ وہ اپنے بچوں کو اُٹھا کر کبھی میرے کمرے کا رُخ کرتی ہیں کبھی ہمارے ایک پڑوسی ہیں ان کی طرف۔ مجبوراً ہم دروازہ ہمیشہ بند رکھتے ہیں۔ ان دو کمروں کے علاوہ اور کہیں بھی جانا انھیں پسند نہیں ایک صاحب اپنے کمرے میں اُٹھا کر لے بھی گئے تھے لیکن وہاں سے وہ واپس آ گئیں۔

آج کل والی بال بڑے زوروں پر ہے۔ پچھلے منگل کو ہم لوگ آپس میں ایک میچ کھیلے تھے۔ دوسری طرف سے ایک اور ٹیم آئی تھی۔ ہماری ٹیم جیت گئی۔ بڑے کانٹے کا مقابلہ رہا۔ ان کی ٹیم بھی

اچھی خاصی تھی۔ برج آج کل کچھ کم کر دیا ہے صرف ایک ربر کھیل لیتے ہیں بات یہ ہے کہ وقت بہت ضائع ہوتا ہے اور رات کو بہت زیادہ جاگنا ٹھیک نہیں۔

میں آج کل Sinclair Lewis (سینکلیر لوئس) کا ایک ناول Dodsworth (ڈوڈز ورتھ) پڑھ رہا ہوں — انھیں Nobel Prize (نوبل پرائز) مل چکا ہے۔ وہ ایک امریکن ناولسٹ ہیں۔ اور انھیں لوگ سب سے بہتر سمجھتے ہیں۔ آج کل کتابیں اچھی آجاتی ہیں اس لئے کافی پڑھائی ہو جاتی ہے۔ میں سچ کہتا ہوں اگر جیل میں کتابیں ملتی رہیں تو پھر کیا ہے۔ یہ فرصت غنیمت ہے اور میں اس سے پورا فائدہ اُٹھانا چاہتا ہوں۔ مجھے کوشش کر کے جہاں تک ہو سکے تاریخ ہی پر کتابیں روانہ کیا کرو۔ انسان کی تاریخ اور اس کے اُتار چڑھاؤ سوسائٹی اور اس کی ہیئت مختلف زمانوں میں۔ یہ سب کچھ میں پڑھنا چاہتا ہوں۔

اور کیا لکھوں۔ سب خیریت ہے۔ بھئی، آماں اور آبا سے ہماری طرف سے عرض کرو کہ اپنی صحت کا خیال رکھیں۔ میں یہ نہیں چاہتا کہ میں تو یہاں جیل میں اپنی صحت بناؤں اور وہاں باہر ہم لوگوں کی وجہ سے وہ یوں پریشان ہوں۔ پتہ نہیں تم لوگوں کو اس کا اندازہ ہے یا نہیں

کہ مجھے واقعی بڑی مسرت ہوتی ہے جب میں تم لوگوں کو خوش دیکھتا ہوں۔ میں لکھنا تو بہت کچھ چاہتا ہوں لیکن فی الحال یہی کافی ہے۔ سعیدہ سے کہنا کہ انگریزی میں خط لکھنا چاہیں تو ضرور لکھیں۔

آپا، آبا کی خدمت میں سلام عرض کرنا۔ تم لوگوں کو دعائیں اور پیار۔

اختر

کراچی جیل

۱۴ فروری ۵۵ء

شیرو بیٹا دعائیں

تمہاری لال مُنیا کے مرنے کا ہمیں سخت افسوس ہوا۔ خدا اسے غریق رحمت کرے۔ بھئی اسلام ارشاد نے جو اسے اپنی بلّی کے لئے مانگا تو اس میں خفا ہونے کی کیا بات ہے۔ بلیاں ہمیشہ سے لال مُنیاں، گوریاں اور سنجانے کیا کیا الا بلا کھاتی رہتی ہیں۔ اور جو یہ بات تم نے لکھی کہ نہ وہ کام کی نہ کاج کی دشمن اناج کی تو اس میں بھی جھنجھلانے والی کوئی بات نہیں۔ مفت خوری اس سوسائٹی میں بہت لوگ کرتے ہیں۔ اور بھئی یہ تو دنیا کا دستور ہے کہ کچھ لوگ کھاتے ہیں اور اینڈتے ہیں اور بہت سارے لوگ محنت کرتے ہیں تاکہ نہ کام کے نہ کاج کے دشمن اناج کے جیسے لوگوں کی شکم پوری کرتے رہیں۔ اور

دور کیوں جاؤ آج کل ہم اور سرور بھی اسی زمرہ میں شمار کئے جا سکتے ہیں چہ چہ یہ تو کچھ فلسفیانہ انداز ہوتا جا رہا ہے اور بھئی تم جانو مجھے نہ تو فلسفہ سے دلچسپی ہے اور نہ فلسفیوں سے۔ سخت بوریت ہے یہ بھی۔

میں جب خط لکھنے بیٹھتا ہوں تو دو ایک سگرٹوں کا خون ہو جاتا ہے ہر ہفتہ کیا لکھے کوئی۔ یہاں کی زندگی کا ڈھرا ہمیشہ سے ایک ہے۔ چنانچہ دماغ کو روشن کرنے کے لئے اور جولانی طبع کے لئے جب تک سگرٹ نہ پیا جائے کچھ بات نہیں بنتی۔ اور چونکہ آج میرے پاس سگرٹ کچھ کم ہی ہیں۔ اس لئے یہ خط تمہیں سخت بور لگے تو معاف کرنا

آج کل ہمیں جو برداشتی کھانا پکانے کے لئے ملا ہے وہ بے تحاشہ efficient (ایفی شینٹ) ہے۔ آج اس نے شام کو پلاؤ پکایا تھا۔ ساتھ میں بیگن کا رائتہ تھا اور کھیر۔ وہ روزانہ ہمارے لگے بندھے راشن سے کچھ نہ کچھ جدت کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ لیکن یہ اچھا ہے کہ جدت کے لئے گنجائش کم ہی ہے۔ سنو پچھلے منگل کو ہمیں جیل کی طرف سے کلیجی کھانے کو ملی اور اس کے دو روز بعد قیمہ۔ ادھر ہم نے کہہ سن کر اپنے کھانے میں تھوڑی بہت تبدیلی کرا لی ہے۔ مثلاً یہی کہ ہفتہ میں ایک دن قیمہ ایک دن کلیجی ایک دن مچھلی اور باقی چار دن گوشت۔ یہ سب لکھنے سے میرا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ تم ہماری خوش قسمتی پر رشک کرو

بہرحال یہ واقعہ ہے کہ زندگی یہاں پر اچھی خاصی گزر رہی ہے۔ آپ کچھ بھیڑ بھاڑ بھی کم ہوگئی ہے۔ اس لئے قدرے سکون ہے۔ شام کو برات کا سماں نہیں ہوتا بلکہ شریفوں کی بستی معلوم ہوتی ہے۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ لوگ اگر یونہی جاتے رہے تو جنگل کا سناٹا چھا جائے گا۔ بس اُلّو کی کسر رہ جائے گی۔ اس وقت مجھے ارشاد بہت یاد آئے گا۔

سنو یہاں پر ایک صاحب ہیں جو بزعم خود سخت احساس کمتری میں مبتلا ہیں۔ ان کا کہنا یہ ہے کہ انھیں بچپن میں کچھ مناسب ماحول نہیں ملا اور تعلیم میں یہ ایک بڑی کمی رہ گئی۔ بہت حساس واقع ہوئے ہیں۔ اور جہاں کسی سے خفا ہوئے یا تو افسانہ لکھ دیتے ہیں یا منہ بسور کر سب سے الگ تھلگ اپنی دنیا بسا لیتے ہیں۔ یار لوگ فوراً انھیں منا لیتے ہیں میری جو کتاب آتی ہے وہ فوراً اس کے متعلق یہ کہتے ہیں کہ میں رات بھر اس کے متعلق سوچ ہی رہا تھا اور میں فوراً وہ کتاب ان کی نذر کر دیتا ہوں۔ جب بہت دن گذر جاتے ہیں تو وہ کتاب مجھے بغیر ختم کئے ہی واپس کر دیتے ہیں یا شاید پڑھ لیتے ہوں میں کچھ یقین کے ساتھ نہیں کہہ سکتا۔

ہاں تو کل برج جما ہوا تھا بڑے زوروں پر۔ اتنے میں ایک جیلر صاحب تشریف لے آئے تو انہوں نے کچھ کپڑوں کے متعلق دریافت

two clubs کیا اور جن صاحب سے پوچھا انھوں نے برجستہ
(ٹو کلبسز) کی کال۔ جیلر صاحب ان کا منہ دیکھتے رہ گئے۔

ادھر چند روز تک کچھ اچھے گانے سُنے۔ سندھ کے ایک ہاری لیڈر
ہمارے ساتھ تین چار روز کے لئے ٹھہرے تھے۔ اپنی Habeus
Corpus (ہیبس کارپس) کے لئے سکھر جیل سے یہاں آئے تھے۔
خوب گاتے ہیں اور کلاسیکل میں انھوں نے ہمیں ملہار خیال اور چند اور
چیزیں سنائیں۔ وہ صبح تڑکے گاتے تھے اور صبح کے حسین سناٹے میں سماں
باندھ دیتے تھے۔ میں بہت خوش ہوا اور انھیں دعا دی۔ وہ بدھ کے روز
چیف کورٹ کے حکم سے رہا کر دیئے گئے۔

گذشتہ ہفتے آپا کو ایک خط لکھا تھا اُمید ہے مل گیا ہوگا۔ تم اپنی
کلاس گول کر کے ہرگز مت آؤ۔ امتحانات قریب ہیں۔ ہاں کبھی کبھی خط
لکھتی رہا کرو۔ بس یہی بہت ہے۔ اور ہمیں دیکھنے کو دل چاہے تو اسلام
کو دیکھ لیا کرو۔

اور کیا لکھیں گیتی نے عرصہ سے خط نہیں لکھا۔ دونوں بدمعاشوں
کو پیار کر لینا۔ بالو کو بہت بہت پیار۔ آپا اور بھائی صاحب کی خدمت
میں سلام عرض کر دینا۔

اچھا اب اجازت دو۔ خدا حافظ۔

سرور اچھے ہیں پتہ نہیں کبھی خط لکھتے ہیں کہ نہیں میں تو کہتا رہتا ہوں لیکن تم اُسے جانتی ہو۔

اختر

کراچی سنٹرل جیل

۲۵ر فروری ۵۵ء

شاہدہ دعائیں

گذشتہ ہفتے کوئی خط نہیں لکھ سکا۔ کوئی خاص بات نہیں بس موڈ نہ تھا۔ ویسے بھی ہر ہفتہ کون لکھے۔ اُمید ہے ۱۴فروری کو جو خط میں نے روانہ کیا تھا مل گیا ہوگا۔

کل کے اخبار میں چیف کورٹ کی فل بنچ کا فیصلہ دیکھا۔ تھوڑی بہت مایوسی ضرور ہوئی۔ اب پتہ نہیں Div. bench (ڈویژنل بنچ) کے سامنے معاملہ کب آئے گا۔ بہرحال مجھے تو ابھی قطعی مایوسی نہیں ہوئی۔ دیکھا جائے گا۔ خدا نے چاہا تو کوئی نہ کوئی بہتر صورت نکلے گی۔

اب گرمیوں کا آغاز ہے اور دن میں تو دھوپ میں خاصی تمازت ہوتی ہے۔ شامیں ابھی اچھی ہوتی ہیں لیکن میں سمجھتا ہوں کہ مارچ کے

دوسرے ہفتہ سے رات میں بھی کافی گرمی ہو جایا کرے گی۔ اگر زیادہ گرمی ہوئی تو باہر سونے کی اجازت مانگیں گے۔ اُمید ہے اجازت مل جائے گی۔ جاڑے تو بہت مزے میں گذر گئے۔ گزشتہ گرمیوں میں جب ہم یہاں آئے تھے تو شروع شروع میں کافی دقت ہوئی لیکن رفتہ رفتہ اس نئی زندگی کے آداب و آئین سے واقف ہو گئے اور اب تو نو مہینے یہاں رہ چکے ہیں۔ بھئی دراصل راحت اور تکلیف کا تصور بہت کچھ ذہن پر منحصر ہے۔ حالات کے مطابق اگر اپنے آپ کو
(ایڈجسٹ) کیا جائے تو پھر کوئی بات نہیں۔

تم نے اپنے پچھلے خط میں لکھا تھا کہ پڑھائی ٹھیک نہیں ہو رہی ہے۔ دیکھو بھئی امتحانات قریب ہیں۔ مانا کہ پریشانیاں ہیں اور ہمارے یہاں رہنے سے تمہیں کچھ نہ کچھ ذہنی پریشانی ہو گی۔ لیکن اس کا مطلب تو نہیں کہ تم اپنی پڑھائی پر بھی اس کا اثر پڑنے دو۔ ہم دونوں کو اس کا افسوس ہو گا۔ اگر تم خدانخواستہ امتحان میں گڑبڑ کر آئیں۔ ویسے ماشاءاللہ تم کافی ذہین ہو اور اگر ابھی سے جی لگا کر پڑھو تو کوئی وجہ نہیں کہ معقول ڈویژن میں پاس نہ ہو جاؤ۔ دیکھو تم منگل کو ملنے نہ آیا کرو۔ مہینہ میں ایک مرتبہ آجاؤ بس۔ تم کہو گی کہ یہ اتنی لمبی چوڑی نصیحت لکھنے کی کیا ضرورت تھی۔ بھئی اگر تم نے اپنی پڑھائی کی کیفیت شاعروں کی طرح سخن گسترانہ

انداز میں لکھی تھی تب تو کوئی بات نہیں ورنہ اس فہمائش کی قطعی ضرورت تھی۔

اس وقت غالباً آٹھ بجے ہوں گے۔ ابھی ابھی عشا کی اذان ہوئی ہے اور ہمارے سروں پر ایک ہوائی جہاز گذرا ہے۔ یہ ہوائی جہاز کمبخت اس قدر قریب سے گزرتے ہیں کہ خدا کی پناہ بعض وقت تو ایک مبہم سا خوف پیدا ہو جاتا ہے اور رات گئے جب یہ گزرتے ہیں تو آنکھ کھل جاتی ہے کبھی کبھی۔ ویسے تو میں گھوڑے بیچ کر سوتا ہوں۔

میں آج کل Asia and Western Dominance (ایشیا اینڈ ویسٹرن ڈومینین) پڑھ رہا ہوں بڑی اچھی کتاب ہے اس سے پہلے (Crusaders in Europe (کروسیڈرز ان یورپ) گزشتہ ہفتہ ختم کر چکا ہوں۔ یہ صدر آئزن ہاور نے لکھی ہے جیسا کہ نام سے ظاہر ہے۔ یہ کتاب انھوں نے Europe (یورپ) میں second front (سیکنڈ فرنٹ) کے متعلق لکھی ہے۔ جہاں وہ متحدہ فوجوں کی کمان کر رہے تھے۔ کتاب میں چونکہ جنگ کے متعلق بہت تفصیل سے واقعات کا ذکر کیا ہے اس لئے کہیں کہیں کچھ خشک سی ہو گئی ہے ورنہ مجموعی طور پر ایک اچھی کتاب ہے۔ یہ انھوں نے صدر ہونے سے پہلے لکھی تھی۔

تمہیں اگر کسی سے مندرجہ ذیل کتابیں دستیاب ہو جائیں تو ضرور لیتی

آنا (برٹش ان ایشیا مصنفہ وہائٹ) British in Asia—White

(سچوایشن ان ایشیا مصنفہ لیٹی مور) Situation in Asia by Letimore

اور کیا لکھوں اب اجازت دو۔ آپا اور ابا کی خدمت میں

سلام عرض کر دینا۔ راشدہ سعیدہ کو بہت بہت پیار۔

اختر

کراچی جیل

۲۵ فروری ۵۵ء

گیتی بیٹا دعائیں

۲۱ فروری کو تمھارا خط ملا۔ پھر ۲۲ کو تم ملنے آئیں اور تم نے جو گلاب کا پھول مجھے دیا تھا وہ آج مرجھا گیا۔ بھئی اگر آئندہ تم قلم لے آؤ تو ہم یہاں لگائیں۔ جی چاہتا ہے یہاں ایک چھوٹا سا باغیچہ لگائیں تاکہ اس کا اُجاڑ پن کم ہو جائے۔ ویسے بھی میں سوچتا ہوں کہ فنِ باغبانی میں کچھ شد بد ہو جائے تو ممکن ہے آئندہ کام آئے۔

ہاں تو لان ٹھیک ہو گیا۔ چلو تمہیں مالی اچھا ملا ہے۔ کھانے اور کپڑے پر اس سے بہتر مالی بھلا کہاں مل سکتا ہے۔ بہرحال جب باہر آئیں گے تو دیکھیں گے کہ مالی نے کیسی چمن بندی کی ہے

کل سے test (ٹسٹ) ہو رہا ہے۔ سنا ہے کہ ہمیں بھی

Commentory (کمنٹری) سننے کو مل جائے گی۔ جیلر صاحب نے وعدہ کیا ہے۔ چلو یہ بھی غنیمت ہے۔ لیکن کمنٹری کرنے والے کچھ اچھے نہیں ہیں Coles (کولز) کو میں نے پہلے بھی سُنا ہے لیکن وہ کچھ dull (ڈل) سا ہے۔ ہاں تو خوجی صاحب اور میر صاحب نے توبہ کی۔ ہم نے پہلے ہی کہا تھا "آسٹریلیا والے ہاریں گے" بھئی ہمیں ہمدردی ہے۔

تین چار روز ہوئے اخبار میں ایک خبر دیکھی کہ تمہارے کالج کی ڈبیٹنگ ٹیم پشاور گئی ہے اور وہاں اسے ایک ڈبیٹ میں پہلا انعام ملا۔ اگر وہ تمہاری دوست ہے تو ہم معذرت کرتے ہیں لیکن سچ تو یہ ہے کہ نام سے اندازہ ہوا کہ کوئی بور لڑکی ہوگی۔ خیر ہمیں کیا۔

آج کل نہ جائے ماندن نہ پائے رفتن والا مضمون ہے۔ مولوی صاحب تو کیا کان کھینچیں گے۔ ویسے تمہاری پٹائی کی سخت ضرورت ہے۔ امتحان قریب ہیں محنت تو کرنی ہی پڑے گی۔ رونے سے تو امتحان پاس نہیں کئے جا سکتے۔

امتحان کے دن بھی خوب ہوتے ہیں۔ مجھے وہ دن یاد آ گئے جب اپنا بھی یہی حال ہوتا تھا۔ سال بھر تو پڑھائی خاک نہیں ہوتی تھی لیکن ادھر ایک مہینہ رہ گیا اور جناب ہم نے پڑھائی شروع کی۔ اب بڑی مشکل یہ ہوتی تھی کہ کیا پڑھیں اور کیا چھوڑیں۔ کیونکہ ظاہر ہے

اتنے کم عرصہ میں سب کچھ تو پڑھا نہیں جا سکتا تھا، اور پھر یہ بھی نہیں معلوم کہ کیا آ رہا ہے پرچے میں۔ ہماری یونیورسٹی میں پرچے آوٹ نہیں ہوتے تھے۔ بہرحال جان ایک مصیبت میں ہوتی تھی۔ لیکن ہم رات میں کبھی بھی ۹ بجے سے پہلے پڑھنے نہیں بیٹھتے تھے۔ چاہے کچھ ہو جائے۔ شام کو یونیورسٹی روڈ پر ایک پھل والے کی دوکان پر ہم تین چار لڑکے جمع ہو جاتے تھے اور سنگترے کا شربت پیتے تھے تاکہ دماغی توازن درست ہو جائے اور پھر گپ شپ لائنز کا ایک چکر لگا کر واپس آتے تھے اور پھر کھانا کھا کر رات کو ۲ یا ۳ بجے تک ڈٹ کر پڑھتے تھے۔ جس دن امتحان ختم ہوا اس دن اس ٹھاٹھ سے Celebrate (سیلیبریٹ) کرتے تھے کہ بس کچھ نہ پوچھو۔ اُسی دن شام کو پرانی کتابیں یار لوگ بیچ کر مزے اُڑاتے تھے یہ گزشتہ زمانہ کی باتیں ہیں۔ اب ان کو دہرانے سے کیا فائدہ۔

اب موسم کچھ بورسا ہو رہا ہے۔ جاڑے صاحب قریب الجا ہیں اور دم بھر کے مہمان ہیں۔ بی گرمی بڑی آب و تاب سے آ رہی ہیں خدا خیر کرے۔ یہ چند ماہ اپنی تیزی سے ہمیں اچھا خاصا پریشان کریں گی۔

اور سنو اس وقت پیر الٰہی بخش کالونی کی مسجد سے مائکروفون سے

اعلان ہو رہا ہے کہ "ایک بچی جس کی یہ عمر، یہ قد اور یہ نام ہے یہاں موجود ہے جن صاحب کی ہو لے جائے"۔ ہر دوسرے تیسرے اسی قسم کا اعلان ہوتا رہتا ہے۔ پتہ نہیں یہ بچے کیوں کھوتے ہیں اور پھر کھو کر مسجد میں ہی پہنچ جاتے ہیں۔ اعلان ختم ہو گیا۔ اور ہم بھی خط ختم کر رہے ہیں۔

آپا اور بھائی صاحب کی خدمت میں سلام عرض کرنا۔ شیریں، اسلام، ارشاد اور بالو کو دعائیں اور بہت سا پیار۔

اختر

کراچی جیل

۲۱ر فروری ۵۵ء

گیتی بیٹا دعائیں

ادھر کئی دنوں سے تمہیں لکھنے کو سوچ رہا تھا۔ لیکن بغیر کسی خاص وجہ کے ٹال جاتا تھا۔ آج موسم بہت حسین ہو رہا ہے۔ ہوا بڑے مزے کی چل رہی ہے۔ سوچا لاؤ خط کیوں نہ لکھ ڈالیں۔

جاڑے تو اب رخصت ہوئے۔ یہ گزشتہ چند مہینے بڑے مزے میں گذرے۔ اب گرمی کی آمد آمد ہے اور مجھے یہ خیال ہو رہا ہے کہ یہ گرمیاں کیسے گزریں گی۔ دن میں دھوپ کی شدت بڑھ گئی ہے اور میرا خیال ہے کہ مارچ کے دوسرے ہفتہ سے تو خاصی گرمی شروع ہو جائے گی۔ راتیں بھی نسبتاً بور ہو جائیں گی۔ بہرحال کسی نہ کسی طرح دن گذر ہی جائیں گے۔ گزشتہ گرمی تو ہم نے بغیر کسی تکلیف کے گزار دی

تھی — ویسے مجھے امید ہے کہ گرمی میں باہر سونے کی اجازت مل جائے گی۔ ہاں تم ایک کام کرو۔ ہو سکے تو اچھے دبیز دو پردے گھر سے سبز رنگ کے بھیج دو۔ میں تم سب لوگوں کو اکثر و بیشتر فرمائشیں کر کے بور کرتا رہتا ہوں۔ آپا کے پاس غالباً پرانے پردے پڑے ہوں گے؟

ملاقات کا تصور ہی میرے لئے بڑا خوش کن ہوتا ہے۔ یہ واقعہ ہے کہ مجھے اس دن کا انتظار رہتا ہے۔ لیکن یہ عجب بات ہے کہ میں دوران ملاقات کچھ زیادہ گرم جوشی کا اظہار نہیں کرتا۔ باتیں بہت سی کرنے کی ہوتی ہیں لیکن وہاں ماحول کچھ ایسا ہوتا ہے کہ میں زیادہ باتیں نہیں کرتا۔ ویسے بھی میں زیادہ باتونی نہیں ہوں۔ دوستوں کے ساتھ گھنٹوں گپ کر سکتا ہوں لیکن وہ بھی زیادہ آدمیوں کے ساتھ نہیں صرف ان کے ساتھ جن سے مجھے تعلق خاص ہو۔ یہاں بہت سے آدمی میرے ساتھ ہیں شام کو ملاقات ہوتی ہے لیکن صرف دو ہی ایک ایسے ہیں جن سے زیادہ باتیں کرتا ہوں۔ باقی سے صاحب سلامت۔

۲۲ر فروری

تمہارا خط آج شام کو ملا۔ بھئی فرینک لی (FRANKLY) یہ خط تمہارا قطعی بور تھا۔

دعائیں۔ اختر

۴ مارچ

پیاری آپا تسلیم

پتہ نہیں کیوں اس وقت آپ سب لوگ بیساختہ یاد آ گئے۔ یہی کوئی دس بجے کا عمل ہو گا۔ ساری جیل میں سناٹا چھایا ہوا ہے۔ میری اپنی بیرک میں سب لوگ غالباً سو چکے ہیں۔ سامنے کے بیرک کے ایک سیل (cell) سے روشنی آ رہی ہے۔ بڑی خوبصورت چاندنی چھٹکی ہوئی ہے۔ دور کہیں رکارڈنگ Recording ہو رہی ہے۔ میں ابھی چند لمحہ پہلے چرچل کی دوسری عالمی جنگ (Second World War) کا چھٹا اور آخری والیوم (Volume) پڑھ رہا تھا۔ لیکن پھر یکایک خیال آیا کہ آپ سے باتیں کی جائیں ممکن ہے کہ یہ خواہش یوں پیدا ہوئی ہو کہ آج اس وقت نسیم میاں اپنے گھر

بیٹے اماں ابا اور بھائی بہنوں سے گپ اُڑا رہے ہوں گے۔

ہماری اور آپ کی دنیا میں کس قدر فصل ہے۔ اس کا اندازہ مجھے اکثر ملاقات کے دن ہوتا ہے۔ یہ سارا فاصلہ ویسے بہت ہے لیکن منٹوں میں طے ہو سکتا ہے۔ یہاں کی دنیا ہی نئی ہے۔ اس کا دُور دُور کوئی تعلق باہر کی زندگی سے نہیں۔ تاہم انسان ہمیشہ اپنے آپ کو حالات کے مطابق ڈھال لیتا ہے۔ آپ مجھ سے اگر شاید دو روز بھی یہ کہتیں کہ تم چھ بجے کے بعد باہر نہ جاؤ تو میں یقیناً تیسرے روز آپ سے کسی نہ کسی طرح اجازت لے کر باہر چلا جاتا۔ میں قطعی آپ سے ناراض ہو جاتا، اگر آپ اس قسم کی قدغن لگا دیتیں۔ لیکن یہاں میں روزانہ مغرب کی اذان کے بعد بغیر کسی چوں وچرا کے، اپنی کوٹھری میں بند ہو جاتا ہوں۔ اور اب تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہی میرا ہمیشہ سے معمول تھا۔ اتنی بڑی تبدیلی کو کیونکر اور کس طرح انسان تسلیم کر لیتا ہے؟۔ یہ تو ایک معمولی سی مثال ہوئی۔ میں باہر روزانہ چالیس سگریٹیں پی جاتا تھا اور یہاں دس۔ کبھی کبھی میں ایک گھنٹہ میں دو سگریٹیں پی لیتا ہوں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بہت جلد جلد پیں۔ میں سوچتا ہوں کہ بھئی یہ دس سگریٹیں خاصی ہوتی ہیں۔ بھلا کوئی تیس یا چالیس سگریٹیں بھی پی سکتا ہے؟

غرضکہ یہاں کی ساری زندگی آپ کی دنیا سے بالکل مختلف ہے

اور مجھے اپنے آپ کو اس ڈھرّے پر ڈالنے میں ایسی کوئی خاص دقت نہیں ہوئی۔ ممکن ہے آپ یہ سوچتی ہوں کہ مجھے بڑی تکلیف ہوئی ہوگی لیکن واللہ کچھ بھی تو نہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کپڑے تبدیل کر ڈالے۔

یہ خط کچھ فلسفیانہ ہوتا چلا جا رہا ہے۔ اور آپ جانتی ہیں، مجھے فلسفہ سے دُور کا بھی تعلق نہیں۔

ہاں تو آپ نے غالباً پہلی مرتبہ کرکٹ میچ دیکھا ہوگا۔ بھلا کیا سمجھ میں آیا ہوگا۔ بہرحال اسلام ارشاد کو بڑی خوشی ہوئی ہوگی کہ اب کیا ہے۔

گیتی کا خط گزشتہ ہفتہ آیا تھا۔ اس نے نقوش کے شخصیات نمبر کے متعلق لکھا تھا۔ اگر آپ دیکھ چکی ہوں تو لیتی آیئے گا تاکہ میں بھی دیکھ لوں۔

اچھا سنیئے! ہم نے باغبانی کا سلسلہ شروع کر دیا ہے۔ آپ کچھ معقول سے بُودے بھجوا دیجئے تاکہ ہم اپنی رہنے کی جگہ بھی سجا لیں۔ کون جانے کب تک یہاں قیام رہے گا۔ سوچتا ہوں فنِ باغبانی پر بھی دو ایک کتابیں پڑھ ڈالوں۔

اب نیند آ رہی ہے۔ اجازت دیجئے۔ سرور آپ کو اور بھائی صاحب کو سلام عرض کرتے ہیں۔ میری طرف سے ان کو سلام کہیئے گا۔ اب تو ایک زمانہ ہو گیا ملے ہوئے بھی۔

اختر

انتظاریہ

(عابد کاظمی اختر کے ایک بہت پرانے دوست ہیں اور اسکول، کالج، یونیورسٹی ہر مرحلہ میں اختر کے ساتھ رہے ہیں آجکل عابد صاحب کراچی کے حبیب ٹیکنیکل انسٹی ٹیوٹ میں استاذی کے فرائض انجام دے رہے ہیں اور کچھ تو اس مصروفیت اور کچھ اپنی مخصوص افتادِ طبع کی وجہ سے وہ اپنا مضمون، وقت پر نہیں دے سکے، اسی لئے اب اس سے معذرت کے ساتھ کتاب کے آخری صفحات میں شامل کیا جا رہا ہے۔)

عابد کاظمی

اختر، میرے دوست!

اختر میرے دوست تم نے منہ چھپا لیا۔ اپنے عزیز دوست یہ تیرے لئے بڑی تکلیف کا باعث ہے۔ نہ جانے کیوں۔ زندگی بڑی مہمل سی لگتی ہے۔ بڑی بیکار سی شے۔ تمہارے بارے میں کیا لکھوں — تمہارے ساتھ زندگی کے سولہ سترہ سال گزارے۔ اس زندگی میں ہزاروں سانحات ہیں۔ خوشگوار ہی خوشگوار۔ رنج تو ہمارے تمہارے درمیان پھٹکا ہی نہیں۔ اور اب یہ لمحات بڑے اُداس سے لگتے ہیں۔ زندگی کچھ ٹھیر سی گئی ہے کیسے اور کدھر سرک رہی ہے مجھے نہیں معلوم۔ سوچتا ہوں عملی آدمی ہوں۔ ذہن پر بھی اور بہت سے جھٹکے لگنے ہیں۔ پُرخطر راہوں میں سر ڈالنا ہے۔ پھر یہ جمود کیوں۔ انسان کے خوشگوار مستقبل کے شیدائی کے لئے جو انسان کی خوشبوں کو برقرار رکھنے کی جستجو میں سرگرداں پھرتا ہو۔ اس کے خوشگوار مستقبل کی تلاش میں کوشاں رہتا ہو۔ اس کے لئے یہ گہرا زخم ہے۔ کیا معنی۔ لیکن میرے

دوست تم سے کیا بتاؤں۔ تمہارا ذکر آتے ہی جذبات ذہن کو پکڑ لیتے ہیں۔ جی اُمڈنے لگتا ہے۔ دُور خلاؤں میں تکنے لگتا ہوں، جی چاہتا ہے چھوٹا بچہ بن جاؤں۔ اور خوب خوب تمہیں تلاش کروں۔ دُور دُور سڑکوں پر پھروں۔ اس اُمید پر کہ شاید تم مل جاؤ۔ کل بس کی کھڑکی سے سرور اپنی کلینک میں بیٹھا نظر آیا۔ اس کے خدوخال چہرہ مہرہ۔ کافی تم سے ملتا جلتا ہے۔ میری نگاہیں ٹھیری گئیں۔ ذہن کہاں کہاں لے گیا۔ سولہ سترہ سال پہلے جب، ہم تم اسکول میں پڑھا کرتے تھے۔ میں اور تم کرکٹ کے بڑے شوقین تھے۔ ایک صبح تم آدھمکے۔ کہنے لگے یار کرکٹ میچ کھیلا جائے۔ ان کالج والوں کو خوب پدائیں گے۔ یہ سمجھتے کیا ہیں۔ اور تم ہوا میں بلا ہلا ہلا کر انہیں چیلنج دیتے رہے تمہارا یہ چیلنج اکڑ بازوں، نمائشی لوگوں۔ طاقتوروں کے خلاف تمہاری زندگی میں تکلیل ہوتا چلا گیا۔ اور آخر وقت تک تم اپنی محنت سے چیلنج دیتے رہے۔ آخر یہ چیلنج تمہاری زندگی تھی۔ یہ تم خود تھے۔ اور اب لوگ کہتے ہیں یہ چیلنج تمہاری زندگی پر خود وار کر گیا ہے۔ بھرپور وار۔ موت کے اس چیلنج سے تم شکست کھا گئے۔ مگر شکست تو نہایت لغو سا لفظ ہے۔ غیر جاندار اصل حیات تو جستجو ہے۔ جو مُرجھائی کلیوں خشک پتوں۔ ٹھٹھرے سمٹے پودوں۔ بھوک کے مارے چہروں۔ زرد زرد جسموں میلے کچیلے کپڑوں میں جنم لیتی ہے۔ اور ایک کروٹ کی منتظر رہتی ہے۔ وہ کروٹ جو جلا بخشتی جو حیات میں تازگی پیدا کرتی ہے۔ خون میں حرارت اور دلوں میں گرماہٹ کا رس گھول کر ایک نئی سحر کو اُجاگر کرتی ہے، اور تم میرے دوست اس سحر کو ڈھونڈتے

رہے مسلسل جد و جہد کرتے رہے۔ الم نصیب تم کے ماروں میں اپنی گفتار سے شرارے برساتے رہے۔ اپنے قلم سے گرم گرم لہو ٹپکاتے رہے او آخر اسی جستجو میں کہیں بہت دُور چلے گئے۔ بہت دُور۔ مگر یہ دُوری ہمارے تمہارے درمیان فاصلہ تھوڑا ہی کم کر سکتی ہے۔ یہ فاصلے تو شکست خوردہ ذہن کی اختراع ہیں۔ چنگاری سلگتی رہتی ہے۔ پھر ایک بہت بڑی آگ بن جاتی ہے جو ماضی کی تمام گھناؤنوں کو خاکستر کر ڈالتی ہے۔ رستے ہوئے ناسور۔ زخم خوردہ تخیلات۔ پراگندہ ذہن۔ جامد و ساکت نظام۔ سب ہی اس بڑی آگ میں بھسم ہو جاتے ہیں۔ پھر بھلا تم ہی بتاؤ۔ تم ہم سے دور کہاں ہو۔ تم تو ایک اُبھرتی ہوئی تہذیب کے آثار ہو۔ نظام نو کی تشکیل کے علمبردار نئی سحر کے وجود میں لانے والے کیا تم بھول گئے۔ یہ تو کل ہی کی بات لگتی ہے۔ جب ہم تم الہ آباد یونیورسٹی میں تھے۔ ۴۸ء ماہ اگست کا زمانہ تھا یونیورسٹی میں بڑی ہماہمی تھی۔ تم نے کہا یار کلاس چھوڑو۔ چلو کافی ہاؤس چلتے ہیں۔ نسیم محسن کو بھی لیا جائے میں نے کہا یہ ایم۔ اے کلاس ہے اس میں سنا ہے کہ کلاس چھوڑنے سے آدمی فیل ہو جاتا ہے۔ مگر یہ کافی ہاؤس کا آخر چکر کیا ہے۔ صبح ہی صبح۔ تم نے کہا یار تم پڑھتے ہو اُردو ہم ایک سیاست کے طالب علم۔ فیل ہونا بڑی چھوٹی سی بات ہے۔ بڑی بات تو محنت کرنا ہے۔ وہ محنت جس میں زنجیریں ٹوٹتی ہیں۔ دل دہلتے ہیں۔ سیلاب بڑھتا ہے۔ میں نے کہا بس بس، یہ مارکس انجل کا فلسفہ اُردو میں کام نہیں آتا۔ میٹھے میٹھے رس میں گھلے ہوئے۔ حیات افروز اشعار کی بات کرو۔ تم نے کہا

چلو حیات افروز قسم کی کافی پلائیں گے جو تمہارے اس مکروہ چہرے پر بھی بشاشت لے آئے گی۔ اور پھر میں تم نسیم مجن کافی ہاؤس پہنچ گئے۔ نسیم نے کہا یہ ماجرا کیا ہے صبح ہی صبح کافی ہاؤس اور وہ بھی کلاس cut کر کے تم نے کہا عقل کے اندھو جاہلو صبح کا اخبار تو پڑھ لیا کرو۔ کل بہار میں دس ہزار کسانوں نے وہ عظیم الشان جلوس نکالا کہ تمام صوبہ میں تہلکہ مچ گیا۔ حکومت تک دہل اُٹھی۔ میں نے کہا بھئی کل نعروں کی آواز تو میں نے بھی سُنی تھی مگر بعد میں معلوم ہوا سبزی والا ہے نسیم اور مجن کچھ خاموش اور سنجیدہ تھے اور تمہاری آنکھوں کی چمک نے مجھے بھی خاموش کر دیا، میں نے سوچا بڑے غلط موقعہ کا مذاق ہے۔ تمہارے چہرے کی دمک اور مسکراہٹ تمہاری مسرت بالکل بچہ جیسی تھی جسے نیا کھلونا مل جائے۔ تم بولتے چلے گئے بڑی دیر تک تمام سیاسی واقعات دوہراتے رہے۔ پھر نسیم اور تم میں بحث چل گئی، ساست زور پکڑنے لگی۔ لیکن میں تمہارے بارے میں سوچتا رہا۔ بارہ ہزار کسان بڑھتے گئے ہاتھوں میں ہل لئے ہوئے زمینوں میں بیج بوتے۔ گیت گاتے نغمے الاپتے۔ رس گھولتے۔ دس لاکھ کسان۔ تمام دھرتی گلابی ہوگئی گیہوں کی پکی پکی بالیاں لہرانے لگیں۔ یکایک ان کی آواز نعروں میں بدل گئیں شیروں کی دھاڑوں سے زیادہ تیز۔ دلوں کو دہلانے والی گرجدار آوازیں تمام اُونچے اُونچے قصر۔ بلند ایوان تھرتھرانے لگے محلوں میں رقص تھم گئے۔ ہاتھوں میں جام ٹھیر گئے تشدد کی آنکھیں جھلس گئیں بہروپئے سرنگوں ہو گئے۔ بارہ کروڑ کسان لاتعداد محنت کش

مزدور۔ ہل کاندھوں پر بندوقیں بن گئے۔ زنجیریں تلواریں بن گئیں۔ دھرتی کے جگر کو چیرنے والے ہاتھ لوہے اور پتھر کے بن گئے۔ گولیاں سنسناتی۔ دندناتی نکلنے لگیں۔ ساری دھرتی سُرخ ہو گئی اس سُرخی سے دُھندلکوں اور سیاہ گہرے گہرے بادلوں کو کاٹتا ہوا مجھے تمہارا چہرہ نظر آیا۔ آنکھوں میں وہی چمک۔ چہرے پر وہی مسکراہٹ۔ نمعلوم ہم کب لوٹے۔ مگر یہ احساس ضرور تھا کہ دل میں کچھ گرمی سی ہے۔

اور پھر ہمارا امتحان سر پر آگیا میں تم اور نسیم پڑھائی میں لگ گئے شام کو کافی ہاؤس میں گھنٹہ بھر مل لیتے اور پھر گھروں کو لوٹ آتے۔ امتحان سے ٹھیک اکیس دن پہلے۔ اسٹوڈنٹ فیڈریشن کے کچھ طلبا نے یونیورسٹی میں اسٹرائک کر دیا۔ بات چھوٹی سی تھی۔ بڑھتے بڑھتے ساری یونیورسٹی میں آگ کی طرح پھیل گئی تین چار لڑکوں نے بھوک ہڑتال کر دی اور وائس چانسلر کے کمرے کے آگے لیٹ گئے۔ تمہاری زندگی میں ہلچل مچ گئی۔ کبھی یونین میں تقریر۔ کبھی ہوسٹلوں میں لڑکوں سے اپیل کبھی یونیورسٹی کے پروفیسران پر لعن طعن اور کبھی صوبہ کی سرکار پر گالیوں کی بوچھار۔ غرض امتحان وغیرہ سب بھول گئے۔ صبح ۵ بجے سے ۱۲ بجے شام تک یونیورسٹی میں دھواں دھار تقریریں۔ پھر طلبا کی تنظیم۔ ان کے اتحاد۔ رات کو ہوسٹلوں میں کمرے کمرے چکر۔ غرض تمہاری انتھک کوششوں سے یونیورسٹی میں مکمل ہڑتال ہو گئی۔ تمہارے والد۔ والدہ۔ تمہاری آپا سب ہی تمہیں سمجھاتے۔ پروفیسر تمہیں دھمکیاں دیتے۔ ضلع کے حکام پولیس سے ڈراتے مگر تم پر تو جنون

طاری تھا۔ غرض سنیچر کی رات کو ڈھائی ہزار طلباء کا مشعلوں والا جلوس نکلا۔ ضلع بھر کے حکام تھرا اُٹھے۔ یوپی سرکار بوکھلا اُٹھی۔ اور تم اس جلوس میں آگے آگے نعرہ لگاتے ہوئے چلتے رہے۔ اور جب یہ جلوس یونیورسٹی سے نکلا تو ایسا لگتا تھا کہ ایک سیلاب امڈ آیا۔ وائس چانسلر نے آخر ہتھیار ڈال دیئے۔ طلباء کی تمام شرائط غیر مشروط طور پر منظور کرلیں وہ پروفیسر جو یہ کہتے تھے یہ چند ناکارہ بیکار سے لڑکوں کا کھیل ہے چُپ رہ گئے۔ تم نے یونیورسٹی گیٹ پر چڑھ کر تقریر کی اپنے جناب پروفیسر صاحب یہ چند ناکارہ بے کار سے لڑکے آپ کو للکارتے ہیں۔ یہ چند اب چند ہزار ہو گئے ہیں۔ یہ چند ہزار چند لاکھ ہو جائیں گے۔ اور پھر یہ بڑھتا ہوا سیلاب آپ کو ضلع کے حکام کو۔ اور یوپی سرکار کو سب کو بہا کر لے جائے گا۔ یہ آپ کی پولیس اپنی سنگینیں چھپالے گی اور طلباء کے اس سیلاب کو روکے نہ روک سکے گی۔ تعلیم مہنگی کر کے اجارہ داری کی بات نہ کیجئے کسی مخصوص طبقہ کی حمایت نہ کیجئے اس پر سب کا حق ہے۔ ان رکشا چلانے والوں کے بچوں کا مل میں کام کرنے والوں مزدوروں کے بچوں کا۔ کسانوں کے بچوں کا۔ دوکانداروں کے بچوں کا۔ اور ان پولیس کانسٹبلوں کے بچوں کا جو آج ہم پر سنگینیں اُٹھائے ہیں۔ ان کے بچے بھی تعلیم حاصل نہیں کر سکتے وائس چانسلر صاحب تشدد اور ظلم سے آگ بڑھتی ہے۔ آپ اپنے کمرہ میں بیٹھ کر اس آگ کو دبا نہیں سکتے۔ سنسناتی گولیوں میں ہی یہ جنم لیتی ہے کیونکہ سنگینوں کے سایوں کی پروردہ ہوتی ہے۔ آج آپ نے اس کا

مظاہرہ دیکھ لیا۔ آپ کا ایرکنڈیشنر سے ٹھنڈا کیا ہوا کمرہ بھی گرما اُٹھا۔ ہماری آوازوں کی تپش آخر آپ کو باہر نکال لائی اور اب لوؤں کے تھپیڑے کھائے ہوئے چہرے بھی ملاحظہ کیجئے۔ ہمارے چہرے مگر یہ جُھلس کر اور تانبہ ہو گئے ہیں ان پر عزم کی پختگی ہے۔ حق کی رمق ہے۔ اتحاد کی چمک و دمک ہے۔ یہ آپ کی آنکھوں کو خیرہ کر دے گی ضلع کے حکام کو بوکھلانے پر مجبور کر دے گی یوپی سرکار کے زندانوں کو جھلسا کر رکھ دے گی۔ اور تم اس طرح للکارتے رہے۔ طلبا نعرے لگاتے رہے ان نعروں کی گرمی سے یونیورسٹی کی اینٹ اینٹ پگھل گئی۔ آج تم وہاں نہیں ہو۔ لیکن میں ضرور وہاں تھا طلبا میں وہی سرگرمی اور وہی حدّت و شدّت ہے۔ اور ان سب کے دلوں میں میں نے ایک ایک اختر چھپا دیکھا تھا۔ جوان کے دلوں کو گرما رہا تھا۔ لوگ غلط کہتے ہیں کہ تم یہاں نہیں ہو۔ تم وہاں بھی تھے۔ اور اب یہاں بھی ہو۔

اور پھر تم پاکستان آ گئے۔ میں دلی میں نوکر ہو گیا، اور وہیں کا ہو کر رہ گیا۔ تمہاری یاد گہری ہوتی گئی دو سال بعد پتہ چلا کہ تم دہلی آئے ہو اور رفیع احمد قدوائی کے یہاں ٹھہرے ہو میں چونکہ ان کے خاندان سے خوب واقف ہوں اس لئے فوراً وہاں پہنچا۔ تمہارا بھرا بھرا جسم۔ تندرست اور توانا قویٰ دیکھ کر حیرت میں رہ گیا میں نے کہا یار یہ پشاوری میوہ پاکستان میں بڑا رنگ دکھلا رہا ہے، تمہارا بے ڈول جسم بھی اچھا خاصہ معقول نظر آنے لگا۔ اور پھر میں نے چٹکی لی۔ سنا ہے بڑی فراخ دل سرکار

سے واسطہ ہے۔ تم کہنے لگے یہاں رہے یا وہاں فرق تو کوئی نہیں۔ یہاں تو سحر کے آثار نظر بھی آتے ہیں۔ وہاں تو بام ثروت کے خوش نشینوں سے چشم نم کی بات بھی نہیں کر سکتے۔ میں نے کہا یار بات سیدھی کیا کرو اور ہماری اپنی سطح پر آکر۔ اور پھر تم مسکرا دیئے۔ میں ڈر گیا میں نے سوچا یہ ظالم اس مسکراہٹ کو کہیں چھوڑ کر نہیں گیا یہ وہاں بھی لے گیا۔ وہاں بھی اس مسکراہٹ سے شعلہ برساتا ہوگا۔ ٹھنڈی ٹھنڈی دیواریں تپتا پا رہا ہوگا کون جانے اس کی زندگی میں کب ٹھہراؤ آئے گا۔

اور کل پلاننگ بورڈ میں جب میں فرخ ڈاکٹر ربانی کرکٹ پر بحث کر رہے تھے تو میں نے کہا یار خوب یاد آیا مجھے تو آج اختر کے پاس جانا ہے تم نے مجھے یاد دہے سینچر کو بلایا تھا۔ کہا تھا گھر آنا کرکٹ کے متعلق کچھ باتیں کریں گے۔ گپیں رہیں گی۔ مجھے معلوم تھا یہ کرکٹ سے بات چلتے چلتے پورے سولہ سترہ برس کی بات بن جائے گی۔ اسکول کا زمانہ۔ یونیورسٹی کے ہنگامے مارکس انجلیس کا فلسفہ معاشی بحران فیض کی غزلیں سب ہی چھیڑو گے۔ میں نے فوراً برنی کو ٹیلیفون کیا۔ تمہارے پاس پہنچنے کی بڑی جلدی تھی بڑی دیر بعد برنی نے ٹیلی فون اُٹھایا۔ میں نے کہا اختر سے کہنا۔ اس نے فوراً میری بات کاٹ کر جواب دیا اختر کا تو انتقال ہوگیا۔

——— ظالم ———

میرا دل میری آنکھوں میں آگیا میرا دل چیخ اُٹھا نہیں ایسا کبھی نہیں ہو سکتا۔ جس نے کبھی شکست نہیں مانی وہ کیسے — نہیں نہیں یہ غلط

ہے۔ اسکول میں رہتے ہوئے کالج کو چیلنج کرتا رہا۔ یونیورسٹی میں طالب علموں کی ہزاروں لڑائیاں لڑتا رہا۔ مزدوروں کسانوں میں آگ بھرتا رہا۔ بڑے چیلنج کو مسکراتے ہوئے قبول کرتا رہا۔ وہ آج — نہیں — برنی تم جھوٹے ہو تم اختر کو نہیں جانتے۔ تم چند گھڑیوں کی دوستی میں اسے کیا سمجھو گے۔ تم اس کی عظمت کیا جانو۔ تم برنی تم تو اسے کل سے جانتے ہو میں تو اسے صدیوں سے جانتا ہوں۔ تم اس کی مسکراہٹ سے ناواقف ہو۔ وہ لافانی ہے۔ وہ ناقابل فتح ہے۔ وہ بغیر سحر آئے کیسے مٹ سکتی ہے۔ نہیں برنی تم — تم لغو باتیں کرتے ہو۔ بالکل لغو۔ اس کی مسکراہٹ انمٹ ہے۔ وہ یہیں کہیں چلا گیا ہے۔ زندگی کی قدروں کی تلاش میں وہ قدریں جو دائمی ہیں۔ جن میں حسن کی پاکیزگی ہے۔ سحر کی سپیدی ہے۔ وہ ان کی تلاش میں ہے اور اپنی پر سحر مسکراہٹ سے وہ ان میں رنگ گھول رہا ہوگا سرخ رنگ۔ دائمی رنگ۔ ایسا رنگ جو حیات کو تازگی بخشتا ہے۔ جو میلے میلے چہروں پر شادمانی اور مسرت بکھیرتا ہے جو ٹھٹھرے سمٹے پودوں پر بالیدگی پیدا کرتا ہے جو زندگی ہے عین زندگی۔

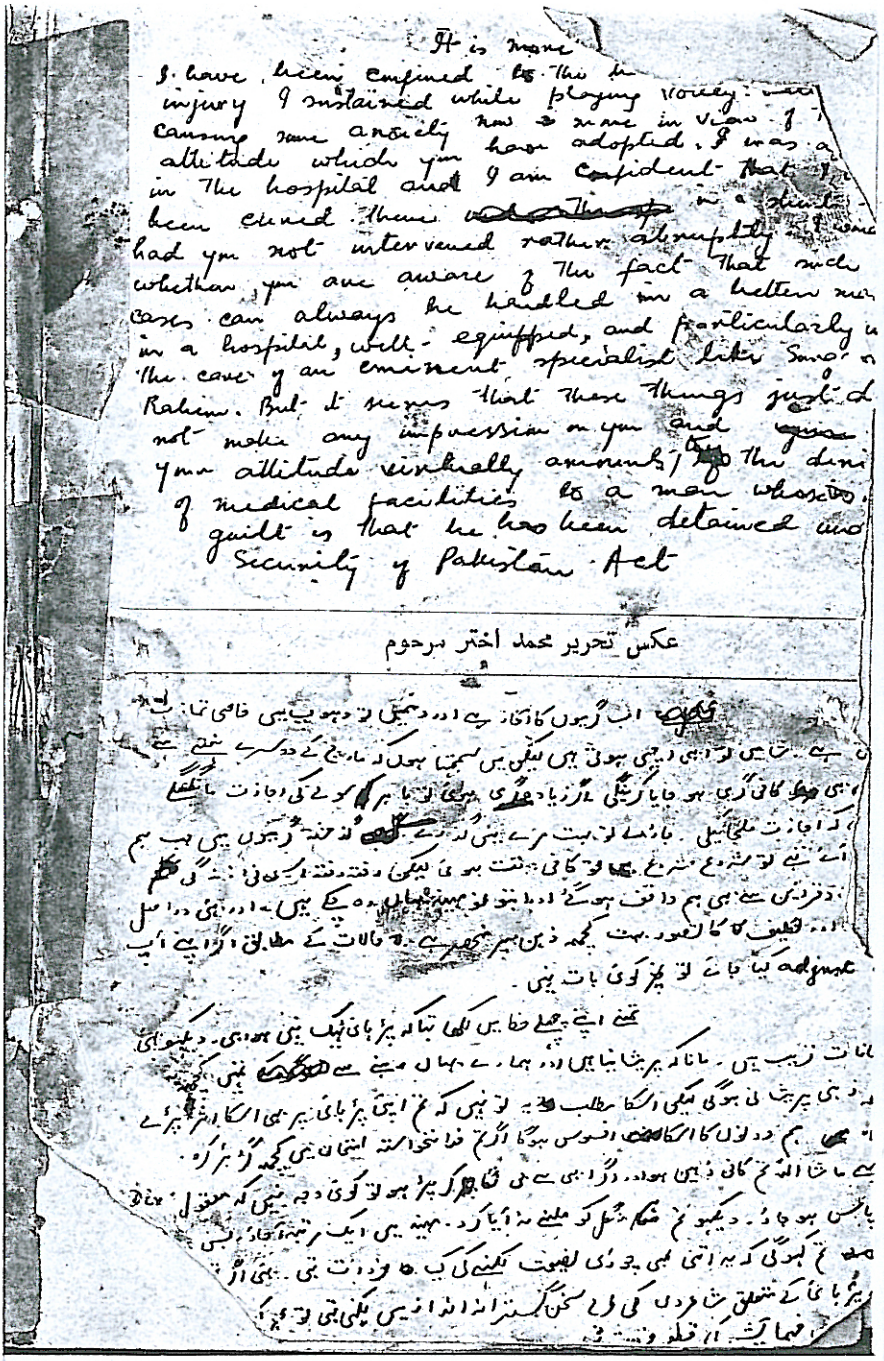

It is more
I have been confined to the h
injury I sustained while playing volley
causing some anxiety now & more in view of
attitude which you have adopted. I was a
in the hospital and I am confident that
been cleared there
had you not intervened rather abruptly
whether you are aware of the fact that such
cases can always be handled in a better man
in a hospital, well equipped, and particularly
the care of an eminent specialist like Sir
Rahim. But it seems that these things just d
not make any impression on you and
your attitude virtually amounts to the deni
of medical facilities to a man whose
guilt is that he has been detained und
Security of Pakistan Act

عکس تحریر محمد اختر مرحوم

اب گرہوں کا اتحاد ہے اور دھمکی تو وہ بے یقینی خاصی تاب
ہے۔ شاید میں تو ابھی زندہ ہوں لیکن میں سمجھتا ہوں کہ ماریخ کے دو کرے ہیں
ابھی وقت کافی پڑی ہو جایا کرتی اگر زیادہ بڑی ہوتی تو باہر کرنے کی اجازت مانگتا
کہ اجازت ملنا آسان ہے۔ مانگے تو بہت مرے ہیں لیکن اجازت ملنا بہت مشکل ہے
آئے ہے تو شروع شروع میں تو کافی دقت ہوئی لیکن وقت کے ساتھ ساتھ آسانی ہو گئی
دفتروں سے ہی ہم واقف ہو گئے اور اب تو بہت سی چیزیں ہو چکی ہیں۔ اور یہی دراصل
وہ تکلیف کا کافور ہو گیا۔ بہت کچھ ذہن پر منحصر ہے۔ حالات کے مطابق اگر اپنے آپ
adjust کیا جائے تو پھر کوئی بات نہیں۔

تم نے اپنے پچھلے خط میں لکھا تھا کہ پڑھائی ٹھیک چل رہی ہے۔ دیکھو ای
حالات قریب ہیں۔ مانگے پریشانیاں اور ہمارے یہاں رہنے سے ہو گی نہیں
ہو ہی پریشانی ہو گی لیکن اسکا مطلب یہ تو نہیں کہ تم اپنی پڑھائی پر بھی اسکا اثر پڑنے
ہم دونوں کا اسکا افسوس ہو گا اگر تم خدانخواستہ اتنا ہی کہہ گزرے۔
ہے ماشاءاللہ تم کافی ذہین ہو اور ابھی سے ہی فائنل کر پڑھ ہو تو کوئی وجہ نہیں کہ معقول
پاس ہو جاؤ۔ دیکھو تم شکر مل کو ملنے نہ آیا کرو۔ مہینہ میں ایک مرتبہ جاؤ بس
تم کہو گی کہ یہ اتنی لمبی چوڑی نصیحت کہنے کی کیا ضرورت تھی۔ بھی اگر
پڑھائی کے متعلق شاعروں کی کوئی کمی رہ گئی تو انشاءاللہ اگلے خط میں پوری ہو جائے گی
تمہارا شفیق